# سیرِ افلاکؒ

رُوحانی مُسافتؒ کی رُوداد

بہ اجازتؒ خاتمُ الانبیاء سرورِ کونین حضورنبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

فقیر تابِش کمال

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ
وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

''جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ۔'' (الحشر۔۷)

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

ایہہ ''سِرُّالافلاک'' اے تحفہ پاک محمدﷺ والا
اِس نُوں تکن والے اُتے نُوری بدّل وَرسی
ربّ دے سوہنےؐ مینوں اَج ایہہ نُختہ دَسیا تابشؔ
اِس پوتھی نُوں جیہڑا پڑھسی دوہیں جہانیں ترسی

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سیر الافلاک

روحانی مسافت کی روداد

بہ اجازت خاتم الانبیاء سرورِ کونین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

فقیر تابش کمال



دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

کمال پبلی کیشنز کی کمال کتابیں

اہتمامِ اشاعت
نہال بخت کمال



کتاب : سیرُالافلاک
مصنف : فقیر تابش کمال
پہلا ایڈیشن : اکتوبر، ۲۰۰۶ء
سولھواں ایڈیشن : دسمبر، ۲۰۲۲ء
تعداد : ایک ہزار
ہدیہ : تین سَو روپے
ناشر : صاحبزادہ نہال بخت کمال
رابطہ : دارالکمال، کمال آباد،
پنڈی روڈ، پنوال، چکوال۔
موبائل: 0300-5144878

کمال پبلی کیشنز راولپنڈی
www.darulkamal.com



دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

# حُسنِ ترتیب


۱) پہلی بات (ابتدائیہ) ۷ — ۹

۲) طریقِ تصوف (علمی مباحث) ۱۰ — ۸۱

۳) سیرُ الافلاک (رُوحانی مسافت) ۸۲ — ۱۶۹

۴) منظومات ۱۷۰ — ۱۷۴


مطمئن سے ہو گئے ہیں یہ حقیقت جان کر
اور بھی اک زندگی ہے ماورائے زندگی

(تابش کمال)

# مردِ چشمِ دُور بیں

آشنائے سرِّ دیں تابش کمال
ہَست عارف بالیقیں تابش کمال

بارگاہش مرکزِ جُود و سخاست
عَاشِقِ شاہِ مُبیںؐ تابش کمال

عالماں اَز دستِ اُو شُد فیض یَاب
سالکاں را عبدِ دیں تابش کمال

بحرِ لُطفِ اُو ندارد ریگ و سنگ
آسمانے ایں زمیں تابش کمال

عَاشقاں را جانِ شیخِ کاملی
مُنکراں را تیغ دیں تابش کمال

اُو کہ داند حَال ہر پیر و جواں
مردِ چَشمِ دُور بیں تابش کمال

بندۂ خاصانِ خاصِ مصطفیٰؐ
اَولیاء را یَک نگیں تابش کمال

واقفِ اسرارِ صُوف و صُوفیا
نکتہ دَانِ عالمیں تابش کمال

فضل الرحمٰن اعظمی

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

# پہلی بات

دینِ متین کی رفیع الشان عمارت فرامینِ الٰہی اور ارشاداتِ نبویؐ پر اُستوار ہے۔ قرآنِ کریم سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا درس ملا اور حضور ﷺ نے اس حکم کے اصولِ بجا آوری مقرر فرمائے۔ قرآن وسنت کی پیروی ہی ایک مومن کی پہچان ہے جو اسے دوسرے انسانوں سے ممتاز اور منفرد شان عطا کرتی ہے۔

تصوف، قولِ الٰہی اور سیرتِ نبوی ﷺ کے عاشقانہ ملاپ کا سفر ہے جس کی بنیادی غایت منزلِ احسان تک رسائی ہے۔ عشق، سلوک وتصوف کی انتہا اور ابتداء بھی ہے۔ صوفی کا قول وفعل رضائے شیخ، حُبِ رسول ﷺ اور خوشنودئ باری تعالیٰ کے آفاق میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس دوران کچھ مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں مَن وتُو کا فرق معدوم ہو جاتا ہے اور قلوب آئینے کی طرح صیقل اور تابندہ دکھائی دیتے ہیں۔ ''سیرُ الافلاک'' انہی مقامات کا بیان اور فقیر کے ایک روحانی سفر کی مختصر رُوداد ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط (لقمان۔۲۰)

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، اللہ نے تمہارے لیے مسخّر کیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں کامل کر دی ہیں۔"

احوالِ مُسافت حسبِ فرمان بارگاہِ نبوی ﷺ میں عرض کیا تو آپ ﷺ نے وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (اور ذکر کرو اللہ کی نعمت کا جو تم پر ہوئی۔ آلِ عمران ۱۰۳) کی روشنی میں اسے تحریر کرنے اور "سیرُ الافلاک" کے نام سے اس کی اشاعت کا حکم دیا۔ راقم بہر حال انہی کیفیات و مشاہدات کے اظہار کا پابند رہا ہے جن کی اجازت دربارِ اقدس ﷺ سے مرحمت فرمائی گئی۔ دمِ تحریر یہ بات ہر آن دھیان میں رہی کہ شریعتِ محمدیؐ ہی چراغِ راہ بنے۔ مسوّدہ بارگاہِ اقدسؐ میں پیش کیا تو سرکارؐ نے نہ صرف اسے شرفِ پسندیدگی بخشا بلکہ بعض مقامات پر اصلاح بھی فرمائی۔

دورِ جدید ابتلا و انتشار سے عبارت ہے۔ تسخیرِ کائنات کے دام اور قیمت انسانی جان چکا رہی ہے اور ترقی کی آڑ میں مادی دھکّم پیل انسان کی فطری معصومیت، امید اور یقین کے درپے ہے، نتیجتاً انسان معاشرتی، نفسیاتی اور اخلاقی گرداب میں پھنس کر ذہنی و فکری مسائل کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ ان دل فگار حالات میں تصوف ہی جاں بہ لب انسانیت کے لیے مژدۂ جانفزا ہے۔ انسان سے پیار تصوف کی اساس، اُمن کا پرچار تصوف کا دُرس اور ذاتِ باری تعالیٰ سے ہم آہنگی تصوف کا مدّعا ہے۔ علم العقائد (ایمانیات) اور علم الاحکام (فقہ) کی طرح علم الاخلاص (تصوف) بھی دینِ مبین کا ایک مستقل ستون ہے اور اس اہم رکن سے مفر تعلیماتِ اسلامی سے عدم آگہی کا مظہر ہے۔

راقم کے نزدیک تالیفِ کتبِ تصوف کا بنیادی مقصد صرف اور صرف ترویجِ خیر اور فروغِ دینِ اسلام ہونا چاہیے۔ کسی مذہب، فرقے، جماعت اور گروہ کے حوالے سے مذمّتی رویہ اُمت کی تقسیم اور بنیادی جوہر (جذبۂ عشق) کے ضعف کا باعث ہی

نہیں بنتا بلکہ یہ عصبیت معاشرے میں انتشار و افتراق کا مُوجب بھی ٹھہرتی ہے۔ وہ تمام سلاسل اور ہستیاں قابلِ تکریم ہیں جنہوں نے کسی بھی سطح پر بالیدگیٔ نفس کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے سالکین کو شوقِ سلوک دلایا اور ہر وہ شخص قابلِ ستائش ہے جس نے احترامِ آدمیت کا درس دیا۔

زیرِ نظر تصنیف دو مستقل ابواب ' طریقِ تصوّف ' ( علمی مباحث ) اور "سیرُ الافلاک" ( روحانی مسافت ) پر مشتمل ہے۔ اسے شائقینِ تصوف کے لیے پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ سالکین ، صاحبانِ ذوق اور اہلِ دل ، تزکیۂ نفس ، تطہیرِ ذات اور پاکیزگیٔ قلب سے بہرہ مند ہوں اور قارئین کو دولتِ ایمان ، گنجینۂ عشق اور متاعِ یقیں نصیب ہو۔۔۔۔ آمین

ایک احتیاط خاص طور پر ملحوظ رہے کہ "سیرُ الافلاک" کا مطالعہ عشق و اخلاص کی پاکیزگی میں ہی شافی اور نفع بخش ہوسکتا ہے۔

کون اے جیہڑا چن لے جائے سُچے نوری موتی
عشق محمدؐ دے دریاؤں جو تارُو ہتھ لگے
حضرت باغ حسین کمالؒ اج تابشؔ ایہہ فرمایا
جو سیرالافلاک پڑھے اس دل وچ دیوا جگے

# طریقِ تصوّف

"آسمان والے ذاکرین کے گھروں کو یوں دیکھتے ہیں
جیسے اہلِ زمین روشن ستاروں کو"۔ (الحدیث)

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال
www.darulkamal.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ وَعَلٰۤی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ

ربِّ کریم نے اس کائنات کو رونق افروز بنانے اور آباد و آراستہ کرنے کے لیے ان گنت انواع تخلیق فرمائیں۔ تاہم وجودِ انسانی کمالِ ربانی کا اچھوتا اظہار ہے۔ اسے کھنکھناتی مٹی سے خلق فرما کر اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔ سورۃ رحمٰن میں ارشاد ہے:

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ ۝ (۱۴)

''اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔''

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی نگاہوں میں عظمتِ آدم اجاگر کرنے اور اس کی حیثیت منوانے کے لیے انھیں اس خاکی پتلے کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ ملائکہ نے بلا تامل صدائے لبیک بلند کی لیکن ابلیس (عزازیل) نافرمانی کا مرتکب ہوا اور مآلِ کار نہ صرف راندۂ درگاہ ٹھہرا بلکہ اس نے انسان کو بہکانے اور بھٹکانے کا چیلنج کرتے ہوئے طبلِ جنگ بھی بجا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوصاف کی حامل مخلوق پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ انسان جو میرے بندے ہیں، تیرے بہکاوے میں نہیں آئیں گے۔

بہشت سے ہبوط کے بعد آدم و حوّا زمین پر آئے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد فتنہ و فساد میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ انسان طبعاً زود فراموش اور ناشکرا ہے سو

رفتہ رفتہ اپنا مقصدِ تخلیق ہی فراموش کر بیٹھا۔ ابوالانبیاءؑ سے خاتم الانبیاءؐ تک تمام پیغمبروں نے بنی نوع انسان میں باہمی محبت، عبادتِ الٰہی اور اجرِ آخرت کا درس عام کیا۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی، رسول اور وجہِ کائنات ہیں۔ ان پر اتاری گئی اُمّ الکتاب ربِ کریم کی طرف سے نازل کردہ آخری آسمانی صحیفہ ہے اور اب تا قیامت یہ باب دوبارہ نہیں کھلے گا۔ حکیم الامت حضرتِ اقبالؒ نے اس حقیقت کا اعتراف یقین کی ارفع ترین سطح پر یوں کیا ہے:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اللہ کے بندے حصولِ حُبِ الٰہی اور درسِ احسان (جسے حدیثِ جبرائیل میں جزوِ دین کہا گیا ہے) کے لیے کوشاں رہے کہ یہ فریضہ اللہ اور نبیٔ کریمؐ نے ان کے سپرد کیا تھا۔ داعیانِ احسان یعنی اہلِ تصوف کی پشت پناہی کے حوالے سے یہ نویدِ سعید، معیتِ باری تعالیٰ پر غیر متزلزل یقین کو مزید پختگی عطا کرتی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ۠

"بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن بھی۔" (النحل۔۱۲۸)

اسی طرح 'کشف الخفاء' میں درج حدیثِ مبارکہ:

"میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں"

سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاءِ کرامؑ یکے بعد دیگرے شریعتِ موسوی کی متابعت فرماتے رہے اور کسی دوسری شریعت کی طرف رجوع کیے بغیر اسی کے احکامات کی تجدید و تاکید پر کاربند رہے۔ بعینہٖ علمِ حقیقی کے حامل اور عشقِ الٰہی و حُبِ رسولؐ سے بہرہ مند صوفیائے کرامؒ کو اُمتِ محمدیہ کی رہنمائی کے لیے بارگاہِ الٰہی اور دربارِ رسالتؐ

سے ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں تاکہ وہ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کی بنیادیں کمزور نہ ہونے دیں، قلوب کو آلائشوں سے پاک صاف کریں اور حضورؐ کی تعلیمات کے ذریعے معاشرے میں امن وآشتی کے فروغ کا باعث بنیں۔

بدقسمتی سے عصرِ حاضر میں کچھ لوگ تصوف کے حوالے سے لاعلمی اور غلط فہمی کا شکار ہیں اور" طریقت شریعت کے مقابل" کا پراپیگنڈہ کر کے اپنے علاوہ دوسروں کی گمراہی کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ حالانکہ بقول حضرت امام غزالیؒ :

"معترضین اس مسلک پر کیا نکتہ چینی کر سکتے ہیں جس کی پہلی شرط ہی طہارت ہے اور ان کے ہاں طہارت کا مفہوم بھی یہ ہے کہ دل کو غیر اللہ کے تصور ہی سے پاک کر دیا جائے۔" **(المنقذ من الضلال)**

اس میں کوئی شک نہیں کہ عجمیت کے زہرناک اثرات نے دیگر علوم وفنون کے علاوہ تصوف کو بھی آلودہ اور متاثر کیا۔ ایرانی تصوف پر صیہونی اثرات کو ہر وہ شخص ملاحظہ کر سکتا ہے جو سید علی ہجویریؒ، غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تصانیف اور صحاحِ ستہ (حدیث کی چھ مستند کتابیں) کا ذہین قاری ہو۔ آخر اقبالؒ کا یہ جملہ کوئی تو معنی رکھتا ہے:

"ایران کی فتح اسلام کی شاندار کامیابی سہی، مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ تصوف کی صورت مانوی ہوگئی۔"

حقیقت یہ ہے کہ شریعت دراصل طریقت کی بنیاد اور طریقت شریعت کی نگہبان ومحافظ ہے۔ جیسے ظاہری طہارت اور وضو کے بغیر نماز جیسے فرض کی بجا آوری کے بارے میں سوچنا کارِ طفلاں ہے بالکل ایسے ہی تزکیۂ باطن کے بغیر شریعت پر بطریقِ احسن عمل پیرا ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تصوف کے وجود، اس کی حقیقت اور حیثیت پر اٹھائے گئے سوالات کی روشنی میں ایمان کو تازگی، روح کو

پاکیزگی اور خیال کو بالیدگی عطا کرنے والی اس نعمت کا متوازن، درست اور بھرپور اظہار کیا جائے تاکہ حقیقی تصوف کے ناقدین اور فارسی کے اس گمراہ کن قول۔۔۔ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کی قطعی تردید ہو سکے جو اِس حد تک عام کر دیا گیا کہ خواندہ و ناخواندہ حضرات بلا تحقیق اس کے قائل ہو گئے۔

تصوف خود کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کرنے، اس کی رضا میں راضی رہنے اور فنا فی اللہ کی منزل کو مستِ اَلست طے کرنے کا نام ہے۔ بہ الفاظِ دیگر پاکیزگیٔ باطن کے عمل سے گزر کر حقیقتِ مطلق سے ہمکنار ہونے کی تربیت تصوّف کہلاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر اولیاء کی مسافت اور ان کے راستے کی توثیق و توصیف ملتی ہے:

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرۃ۔۱۶۵)

''اور جو لوگ مومن ہیں اللہ ہی سے شدید محبت کرتے ہیں۔''

یہی مضمون ایک اور مقام پر یوں بیان ہوا ہے:

یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ ۝ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ۝ (الشعراء،۸۹۔۸۸)

''اس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، سوائے اس کے کہ کوئی قلبِ سلیم لئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔''

گویا اللہ کی رضا اور محبت کے لیے کوشش، قلبِ سقیم کو قلبِ سلیم میں بدلنے کی تگ و دَو اور اللہ کے رنگ میں ڈھلنے کی جستجو مومن کا امتیازی وصف اور ایک سالک و صوفی کا طرزِ حیات ہے۔ ایک مقام پر ذاتِ باری تعالیٰ نے خود نبیٔ کریم ﷺ کو تلقین فرمائی کہ مجاہدہ اور عبادت میں مصروف رہیں اور توجہ حقیقتِ ابدی پر مرکوز رکھیں:

فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۝ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ۝ (الم نشرح،۸۔۷)

"پس اے رسول ﷺ جب آپ فرضِ منصبی (تبلیغِ اسلام) سے فارغ ہوں تو عبادت میں محنت کیجیے اور اپنے رب کی طرف راغب رہیے۔"

تطہیرِ قلب خوشنودیٔ الٰہی کا اولین زینہ ہے اور اس کام کی انجام دہی شیخِ کامل سے فیض یابی کے بغیر ناممکن اور خارج از امکان ہے۔ شیخ سے مراد وہ عارف ہے جو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں رکھتا اور دنیا کو پرِ کاہ سمجھتا ہے۔ سورہ یونس (۶۲) میں ارشادِ ربانی ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

"آگاہ رہو کہ اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

آج کل تصوف اور صوفیاء کے حوالے سے بلا تحقیق شرک کا فتویٰ صادر کرنے کی روش چل نکلی ہے۔ یاد رہے کہ شرک اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام وافعال میں کسی غیر کو برابر ومساوی ماننے اور اس کی الوہیت وعبادت میں کسی دوسری ہستی کو شریک ٹھہرانے کا نام ہے لیکن حصولِ حُبِ الٰہی کی خاطر کسی کا دامن تھامنے اور رموزِ عشق سیکھنے سے مذکورہ پہلو نہیں نکلتا بلکہ یہ عمل فرمانِ الٰہی اور سنتِ نبوی ﷺ کی ذیل میں آتا ہے۔ ہاں اگر کچھ مقامات پر کسی نے اپنی سہل انگاری اور کم فہمی کے سبب اپنے بزرگوں کی تعلیمات سے روگردانی، پیغامات سے چشم پوشی، روایات سے انحراف اور اُن کے مزارات پر میلوں ٹھیلوں کے اہتمام میں راہِ فلاح ڈھونڈ لی ہے تو اس میں تصوف کا کیا دوش اور اہلِ طریقت کا کیا قصور۔

دراصل ذاتِ باری تعالیٰ شہ رگ سے قریب تر ہونے کے باوجود ایک مخفی خزانہ ہے۔ جس طرح دنیاوی علوم وفنون کی باریکیوں سے آگاہی کے لیے کسی ماہر استاد کی شاگردی ناگزیر ہے اسی طرح اللہ کی محبت جیسے گہرے اور سنجیدہ سوال کو سمجھنے کے لیے

بھی ایک کامل رہبر کی پیروی لازم ہے۔کوئی اس وقت تک ان رُموز سے آگاہ نہیں ہو سکتا جب تک اپنا ہاتھ کسی عارف کے ہاتھ میں نہ دے۔ یہ قولِ ربانی

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔" (المائدہ۔۳۵)

اس ضمن میں نہ صرف ایک شرعی دلیل اور حکم کا درجہ رکھتا ہے بلکہ اس امر کا واضح اظہار بھی ہے کہ معیتِ باری تعالیٰ کے لیے مرشد کا وسیلہ کس قدر ضروری اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شرح کے مطابق:

"اس آیتِ مبارکہ میں وسیلہ سے مراد نہ تو ایمان ہے کہ ایمان داروں سے تو پہلے ہی خطاب ہو رہا ہے اور نہ ہی اعمالِ صالح نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کہ یہ عباداتِ بدنی تقویٰ میں شامل ہیں۔اسی طرح جہاد بھی مراد نہیں کہ وہ بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ پس وسیلے سے مراد ارادت ہے، بیعت اور مرشدِ طریقت ہے۔" (القول الجمیل)

شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی اس آیتِ مبارکہ کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ مسلم شریف کی یہ حدیثِ مبارکہ بھی موضوعِ بالا کو تقویت پہنچاتی ہے:

عَنْ عَبْدُاللّٰهِ بِنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ:
مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص اِس حال میں فوت ہوا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرا۔"

ضرورتِ شیخ کے حوالے سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا فرمان دیکھیے :

''دین (تصوف) کا معاملہ صنائع میں کسی صنعت سے کم نہ سمجھا جائے، کوئی صنعت بھی بغیر استاد کے حاصل نہیں ہوتی پھر دین (تصوف) بغیر سیکھے کیسے حاصل ہو سکے گا۔'' (وصایا و ملفوظات)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے خیال میں :

''ایمان وعمل کے ظاہری اور خارجی پہلو تو کتابوں سے دریافت ہو سکتے ہیں لیکن قلب کو مرتبۂ احسان تک پہنچا دینا، تزکیۂ باطن، تجلیۂ نفس، تطہیرِ اخلاق، بغیر ایک زندہ شخصیت، بغیر ایک مرشدِ کامل کی وساطت کے کیونکر ممکن ہے۔'' (تاریخِ تصوف۔ ص، ۲۳۰)

مزید تائید کے لیے حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی رائے بھی ملاحظہ ہو:

''کوئی علم یا فن کسی استاد کی شاگردی اختیار کیے بغیر نہیں سیکھا جا سکتا۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا صحیح فہم حاصل کرنا کامل اور ماہر استاد کے تعلیم دینے پر موقوف ہے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے کتاب اللہ کے اسرار اور سنتِ رسولؐ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی، پھر اس کلیہ سے تصوف کو مستثنیٰ کیوں کیا جائے، اس کے سیکھنے کے لیے مرشدِ کامل کی ضرورت کا انکار کیوں کیا جائے۔'' (دلائل السلوک، ص ۳۰۲)

ایک سالک کسی نبی یا ولی کو لائقِ عبادت ہرگز نہیں سمجھتا بلکہ اُن سے عبادت اور محبت کے آداب سیکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مکتبِ عشق میں پہلے اتالیق خود نبی کریمؐ اور اولین شاگردان صحابہ کرامؓ تھے۔ صحابہؓ نے آپ ﷺ سے رموزِ عشق اور آدابِ بندگی سیکھے اور آپ ﷺ نے ان کی جانب سے پیش کی گئی تعظیم ہمیشہ خوش دلی سے قبول

فرمائی۔ لہٰذا ایک مرید کی جانب سے احترامِ شیخ کو تکریم کی بجائے شرک گردانناانتہائی نامناسب اور سخت ناروا ہے۔

قلبِ انسانی جسم کا سیّدوسردار، مقامِ الٰہی اور قصرِ عشق ہے جس کی تابندگی، رخشندگی اور جِلا کے لیے کسی عاشقِ صادق کی صحبت ضروری ہے۔ سالک اور صوفی کا باہمی رشتہ ایک دھاگے میں پروئے دوموتیوں جیسا ہے۔ بڑے موتی (شیخ) کی چھَب جب چھوٹے موتی (سالک) پر پڑتی ہے تو وہ اور بھی جگمگانے لگتا ہے، یوں اس کی وقعت پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ..... "روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جائیے" والا معاملہ ہے۔ بقول میرزا عبدالقادر بیدل:

صحبتِ صاف دلاں جوہرِ اکسیر غناست
بے صدف قطرہ محال است کہ گوہر گردد

(صاف دلوں کی صحبت اکسیر ہے جو انسان کے اندر نغمۂ عشق جگاتی ہے۔
یہ ناممکن ہے کہ کوئی قطرہ، سیپی کے بغیر موتی بن جائے۔)

دل خواہشوں کا مرکز، آرزوؤں کی آماجگاہ اور تمناؤں کا منبع ہے۔ یہ مقام ارمانوں اور حسرتوں سے عبارت ہے۔ سالک جب تک بیت القلب میں صرف اور صرف محبوب کو بطور مقصود نہ بسالے، پاکیزگیٔ نفس کا حامل نہیں ہوسکتا۔ حقیقی محبوب کے شایانِ شان بنانے کے لیے اسے آلائشوں سے پاک رکھنا ضروری ہے کیونکہ نقشِ حقیقت شفاف لوح پر ہی ثبت ہوتا ہے اور جلوہ گاہِ حقیقت میں ریا و دغا کی کوئی گنجائش نہیں۔ سید عبدالکریم جیلانیؒ نے اس ازلی سچائی کی عجیب منظرکشی کی ہے:

القلب عرش الله ذوالامکان — هوتیه المعمور فی الانسان
فیه ظهور الحق فیه لنفسه — و علیه حقا مستوی الرحمن
خلق الاله القلب مرکز سره — و محیط دور الکون والاعیان

"قلب با اقتدار اللہ کا عرش ہے اس کی ہویّت انسان میں معمور ہے یعنی تمام وجودِ انسانی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ قلب میں حق کا ظہور ہے۔ بالتحقیق قلب رحمٰن کی قیام گاہ ہے۔ باری تعالیٰ نے دل کو اپنے راز کا مرکز بنایا ہے۔"

درحقیقت نفسِ امارہ اور نفسِ لوّامہ کا خروج ہی نفسِ مطمئنہ کے قیام کا استعارہ ہے۔ نفسِ راضیہ کے حصول اور جوہرِ حقیقی تک رسائی کے لیے صاف ماحول اور نورانی فضا مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ جسم سے اٹھ کر جوہر اور جوہر سے آگے نفسِ کلیہ تک پہنچنا ہی مدّعائے سلوک ہے۔ اس نفس کے تحت ہر قسم کی مخلوق ہے علوی بھی، سِفلی بھی لیکن یہ بجائے خود کسی کا عین وغیر نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ اس سے کہیں آگے جلوہ گر ہے کیونکہ عین اور غیر عین اس کے احاطۂ نور وظہور سے قاصر ہیں یعنی نفسِ کلیہ کے بعد نفسِ اعتبار ہے جو ایک سچے طالب کی معراج ہے۔

برصغیر بالخصوص اور عالمِ اسلام بالعموم تصوف کے معاملہ میں گم کردہ راہ ہو چکا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ قوت القلوب، اللمع فی التصوف، التعرف المذہب اہل التصوف اور طبقات الصوفیہ جیسی تصانیفِ عرش صفات کی موجودگی میں یہ موشگافیاں ہوئی ہوں کہ تصوف ہرزہ کاروں کی جائے پناہ بن گیا تھا۔ قرآن وحدیث میں واضح طور پر تصوف کا جمال وجلال افروز بیان ملتا ہے۔ خاص طور پر سورۃ انفال کی یہ آیت یہود پرست دشمنانِ اسلام کے لیے تازیانہ ہے جو شہادتِ تصوف فی القرآن کے منکر ہیں:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ج (۱۷)

"اور اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب آپؐ نے مٹھی بھر کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ آپؐ نے نہیں بلکہ (دراصل) اللہ نے پھینکی تھیں۔"

یہاں رسولِ کریمؐ کی حیثیتِ مبارکہ بطور سالک نظر آتی ہے جبکہ ربِ کریم ایک شیخ کے طور پر آپؐ کی پشت پناہی فرما رہے ہیں۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی قلیل تعداد اور نامساعد حالات کے باوجود فتحِ مبین صرف اور صرف عنایتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی کی مرہونِ منت تھی۔ معلوم ہوا کہ شیخ ظاہری و باطنی ہر دو ذرائع سے سالک کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اسی طرح تمام انبیاءِ کرامؑ اللہ کے بندے اور سالک ہیں۔ یہ مرتبۂ بلند صرف حضور ﷺ کو عطا ہوا کہ محبوبِ حق قرار پائے اور خود ربِ کائنات اور فرشتے آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ
وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

''اے میرے پیارے اللہ، محمد ﷺ نبیِ اُمّی پر اور اُن کی آل اور اصحاب پر صلوٰۃ و سلام اور برکتوں (کے پھول) نچھاور فرما۔''

سچی طلب اور ذوقِ سلیم کے حامل کسی شخص کو اگر خوش بختی سے مرشدِ کامل میسر آ جائے تو پھر باقاعدہ تربیت کے لیے بیعت کا مرحلہ آتا ہے۔ بیعت دراصل مرشد کے حکم پر سر جھکا دینے اور فرمودۂ شیخ سے سرِمُو انحراف نہ کرنے کا نام ہے۔ تاریخ میں بیعتِ رضوان اور بیعتِ عقبیٰ اوّل و ثانی آپؐ کی سنت کے طور پر موجود ہیں اور عُشاق تو سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی فرض جانتے ہیں۔ اولیاء و علماء نے بیعت کی تاریخی اہمیت بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت صحابۂ کرامؓ کی بیعت، ہجرت کے لیے بیعت، جہاد کے لیے بیعت، معاہدے کی پاسداری اور تقویٰ پر قائم رہنے کی بیعت، ہر بیعت کی بنیاد امر بالمعروف ونھی عن المنکر ہے۔ خاص طور پر خلفائے راشدینؓ کے بعد جب خلافت، بادشاہت و ملوکیت کی راہ پر گامزن ہوئی تو صوفیاءؒ نے اسی آیتِ مبارکہ کو مدّعائے تصوف مان کر بیعت کی سنت کو زندہ رکھا۔

نیک کاموں کی انجام دہی وتبلیغ اور برے کاموں سے احتیاط واجتناب مبتدی کے لیے اولین درس ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور نبیٔ کریمؐ نے حضرت جریرؓ سے بیعت لی اور فرمایا: ''تم پر ہر مسلمان کی خیرخواہی لازم ہے۔''

اسی طرح بہت سارے انصار سے بیعت لی گئی۔ شیخ کی رضا اور خوشنودی کے مطابق امورِ بیعت کی انجام دہی سالکین کے لیے بنیادی امر ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشادِ پاک 'اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ'، گویا فقر کی نعمتیں عطا کرنے والے رب کے سامنے عاجزی، انکساری اور محتاجی کا اظہار ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے مسکینوں میں اٹھایا جانا پسند فرمایا۔ تحصیلِ علم اور یادِ الٰہی میں مصروف اصحابِ صفہؓ پر آپؐ کی خصوصی توجہ اور اُن اولین فقراء کے ساتھ نشست و برخاست اس ضمن میں ایک روشن حوالہ ہے۔ اسی طرح ایک سالک بھی شیخ کی دنیاوی حیثیت نہیں دیکھتا۔ وہ صرف اور صرف رضائے شیخ کا طالب ہوتا ہے اور ہمہ دم۔۔۔۔ ''تیرے ہتھ وچ ڈور وے سائیاں'' کی مالا جپتے ہوئے زبانی ہی نہیں قلبی سطح پر بھی یہ اقرار وعہد کرتا ہے کہ اپنے مرشد کی رہنمائی میں اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسُول پر کاربند رہے گا۔ یوسف سلیم چشتی کے نزدیک:

''بیعت نصِ قرآن میں شامل ہے بلکہ تجدیدِ بیعت بھی۔'' (تاریخِ تصوف)

فقیر کا خیال ہے کہ اس ضمن میں ایک یہی آیت منکرینِ تصوف کے اصلاحِ احوال کے لیے کافی ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

''بے شک اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جس وقت وہ درخت کے نیچے آپؐ کی بیعت کر رہے تھے۔'' (الفتح۔۱۸)

بیعت دراصل ایک مرید کے لیے نئی ولادت کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان کی دنیا میں آمد اور اس کی شخصی پہچان کا حوالہ اس کے والدین کے مرہونِ منت ہے، اسے ولادتِ ظاہری

کہتے ہیں جبکہ ولادتِ معنوی شیخِ کامل کے ساتھ بیعت سے مخصوص ہے۔ ظاہری ولادت کا عارضی رشتہ سانس کی ڈوری سے بندھا ہوتا ہے لیکن ولادتِ معنوی ابدی حیات کی حامل ہے۔ قبر، برزخ اور حشر میں ایک سالک نبی کریمؐ کے بعد اپنے شیخ کی نسبت سے ہی پہچانا جائے گا۔ فرمانِ مبارک کہ" انسان قیامت کے دن اُسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا جس سے محبت رکھتا ہو۔ (بخاری شریف)" میں اِسی جانب اشارہ ہے۔

طریقِ تصوف میں بیعت سے مراد محض یہ نہیں کہ کسی شخص کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر زبانی اقرار کرلیا جائے کہ بیعت کرنے والا اعمالِ صالحہ سرانجام دے گا بلکہ فیض یابی اور فیض رسانی کے باب میں سالک و شیخ کے درمیان ہم آہنگی اور دلوں کی باہم پیوستگی انتہائی ضروری ہے۔ فنا فی الشیخ کے ابتدائی مرحلہ کے بعد فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزل آتی ہے لیکن یہ سوغات نبی کریمؐ کی انتہائی عقیدت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کے بعد ہی ایک سالک مقصودِ حقیقی فنا فی اللہ کے دائرے میں داخل ہوسکتا ہے۔ اکابرین کے مطابق فنا فی الشیخ ہی دراصل فنا فی اللہ کے مرتبۂ عالیہ پر متمکّن ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل شکل یقیناً معاون ثابت ہوگی:

| فنا فی اللہ | فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم | فنا فی الشیخ | سالک |
| --- | --- | --- | --- |
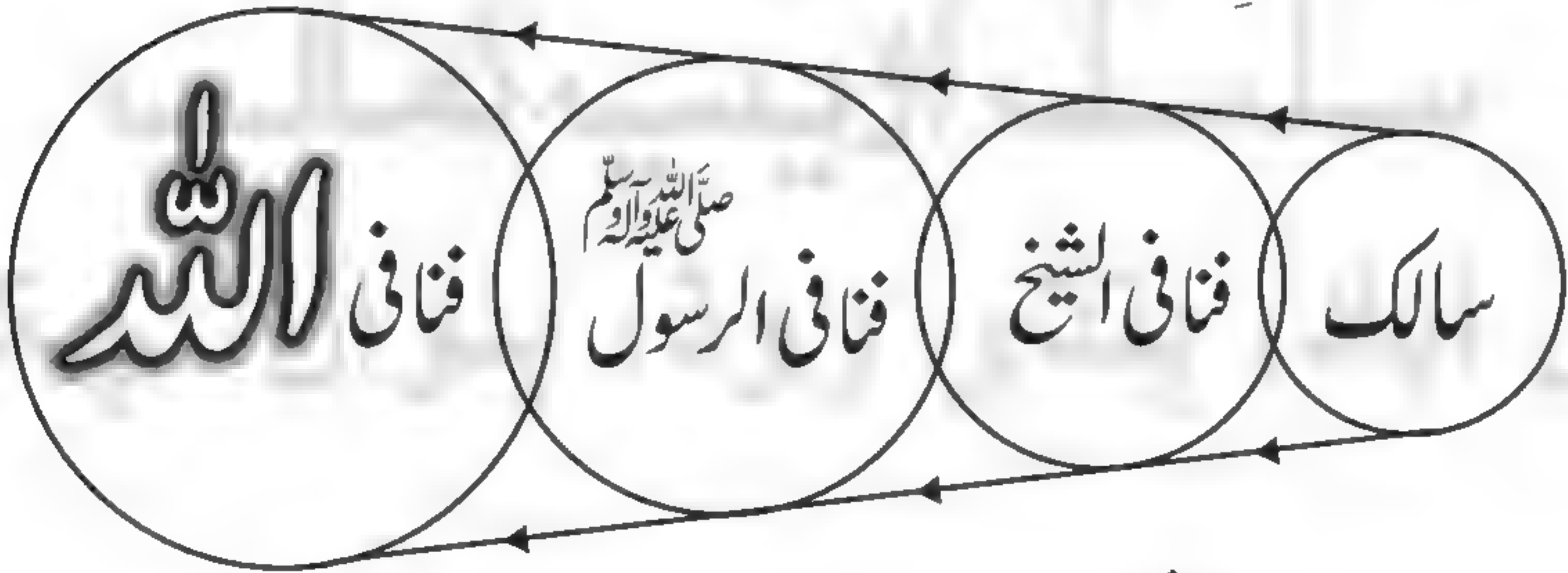
پس ظاہر ہوا کہ حُبِ شیخ ایک سالک کی پہلی ترجیح ہونی چاہیے اس کے بعد ہی اس پر حُبِ رُسولؐ اور حُبِ الٰہی کے در کھلتے ہیں اور وہ رشکِ ملائکہ کے درجے پر فائز ہوتا ہے لیکن یہ درجہ محض عبادت سے نہیں ملتا بلکہ اس کے لیے صحبتِ شیخ بنیادی شرط ہے۔

عارفِ کامل کی زندگی سماجی وروحانی سطح پر عام آدمی سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ کی اطاعت اور نبی کریمؐ کی پیروی اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ اسے...... "بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا درس ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا میں نہیں ہوتا اور کارِ جہاں کی انجام دہی کے دوران بھی اس پر "دست بہ کار دل بہ یار" والی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اگر شیخ کتاب وسنت پر کاربند ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے متوسّل در در کی خاک چھانتے پھریں، اور مرید کو بھی اگر خوبیٔ قسمت سے ایسا گوہرِ نایاب میسر آ جائے تو بیعت وہدایت پر قائم رہتے ہوئے جگہ جگہ ماتھا ٹیکنے کی بجائے:

لوکاں لبھّے ون سونے بیلے بنّے
میں تے ہکا تیں سنگ لائیاں مرشد سائیاں

کا سبق یاد رکھنا چاہیے۔ ایک عارف کی نگاہِ کمال کسی طور اکسیر سے کم نہیں۔ وہ جوہر دیکھ کر نفسِ کلیہ تک لے جاتا ہے۔ الحمد للہ عالمِ اسلام ایسے مردانِ کامل سے کبھی محروم نہیں رہا۔ یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ اس امر کے دعویدار تو ہر دور میں رہے ہیں لیکن ماہیتوں کے سلسلے میں اعیانِ ثابتہ کی شناخت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

ہر مسافر پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس وناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

حقیقت یہ ہے کہ چند آستانے ہی اس لائق ہوتے ہیں کہ وہاں سرِ تسلیم خم کیا جائے ورنہ خرد کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے انسان جُنوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور یوں ہوش کے بیوپار میں یہ سودا بہت مہنگا پڑ جاتا ہے۔ یہ اُمتِ مسلمہ کی خوش بختی ہے کہ اللہ کریم نے مومنین کی رہنمائی اور ہدایت کے خصوصی انتظامات فرما رکھے ہیں۔ جب مومن اپنے رب کی طرف صدقِ دل سے متوجہ ہوتا ہے تو ستر (۷۰) ماؤں سے

زیادہ مہربان ذات اپنی رحمتوں اور شفقتوں کے در اُس پر یوں وا کر دیتی ہے کہ منازل، مناصب اور مراتب اس کی راہ تکنے لگتے ہیں۔ یہاں ستر ماؤں کا ذکر بھی استعارۃً آیا ہے۔ اس نکتے کی تفہیم انسان پر حیرت کے در کھولتی چلی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فقیر کے استفسار پر ارشاد فرمایا کہ اماں حواؑ سے لے کر سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا تک ستر بہترین مائیں مراد ہے۔ یعنی ذاتِ باری تعالیٰ تاریخِ انسانی کی ستر ارفع ترین ماؤں سے بھی زیادہ مہربان ہے اور اپنے بندوں پر نہ صرف رحم فرماتی ہے بلکہ ان کی خطا پوشی بھی کرتی ہے۔ اب یہ سالک پر منحصر ہے کہ زینے طے کرتا چلا جائے، شرط صرف عملِ پیہم کی ہے۔ اس سلسلہ میں جدوجہد کرنے والوں کو یوں مُژدہ سنایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ٥

"اور جو لوگ ہم سے ملنے یا ہم تک پہنچنے کے لیے مجاہدہ کرتے

ہیں، ہم یقیناً انھیں اپنی طرف آنے والی راہیں دکھا دیتے ہیں۔

اور بے شک اللہ اہلِ احسان کے ساتھ ہے۔" (العنکبوت۔۶۹)

گویا سالکین کی پرورش اور افزائش کا اہتمام خود اللہ اور اس کے رسولؐ فرماتے ہیں لیکن دربارِ رسالتؐ تک باریابی شیخ کا دامن تھامے بغیر قطعی ناممکن ہے۔ مولانا رومؒ کے خیال میں اگر کسی نے نادر طور پر تنہا یہ راستہ طے کر بھی لیا ہو تو بھی وہ یقیناً کسی کاملِ وقت کی غائبانہ توجہ اور فیض ہی سے منزلِ مقصود تک پہنچا ہوگا۔ راقم کی نظر سے بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس میں ایک مرید کسی مرشدِ کامل کی رہنمائی کے بغیر سرسبز ہوا ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علم و عمل دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ تاہم علم و عمل، عشق اور عشق ان دونوں کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ ورنہ بقول حضرت سلطان باہوؒ:

ع ساون مانہہ دے بدلاں وانگوں پھرن کتاباں چائی ہو

والا ناٹک ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اگر ایک لفظ میں تصوف کی تعریف کی جائے تو بقول حضرت بلھے شاہؒ......
"اک نقطے وِچ گل مکدی اے" اور وہ نقطہ ہے "عشق"۔ یہ عشق ہی تھا جس نے جلال الدین رومیؒ جیسے عظیم عالم کو شمس تبریزیؒ کے سامنے سر نیہوڑانے پر مجبور کر دیا۔ حقیقت لباسِ عشق میں جلوہ گر ہوئی تو سب کچھ ہیچ معلوم ہوا اور آپؒ:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

کہتے ہوئے فنا فی الشیخ ہو گئے۔ یہ انتہائے عشق، حُبِ شیخ کی منزل کا اوّلین زینہ ہے۔ مرشد کی توجہ اور فیضانِ نظر ہی طالبِ خیر کو اللہ سے جوڑتا اور صراطِ مستقیم پر لاتا ہے۔ بیعت مکمل سپردگی ہے اور نفیٔ ذات۔ ہر غیر کی نفی سوائے ذاتِ واحد کے، تاہم اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ نفیٔ ذات اور "میں ناہیں سبھ توں" سے مراد خود کو بھلانا نہیں بلکہ حقیقتِ عظمیٰ کے سامنے سرنڈر (Surrender) کرنا ہے، یعنی سالک:

ع تو جس بات پہ راضی مولا، تابشؔ بھی اس بات میں خوش

کی تفسیر بن کر اس عقیدہ کا حامل ہو جائے کہ اس کی بقا صرف اور صرف قربِ باری تعالیٰ میں ہے۔ بہت سے حضرات اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کی من پسند تفسیر و تشریح سے سادہ دلوں کو گمراہ کرتے ہیں جبکہ اقبالؒ نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنی خودی سے غافل انسان ہرگز ہرگز داخلِ جنت نہیں ہوں گے۔ انسان کو اپنے نفس کی شناخت کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ بندہ اپنے رب کو پہچان سکے۔

نصیرؔ کھیل نہیں ہے شعورِ ذات و صفات
خدا شناس کہاں وہ جو خود شناس نہیں

یعنی حفاظتِ خودی بھی خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا ایک ذریعہ ہے۔

سلوک جسے کتبِ احادیث میں لفظِ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے دراصل حقیقتِ عظمیٰ کی تلاش کا سفر ہے جس میں عبادات و مجاہدات چراغِ راہ اور قلتِ کلام، قلتِ طعام اور قلتِ منام زادِ سفر کا کام دیتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کو اخروی زندگی کے لیے رختِ سفر تیار کرنے کا حکم دیا ہے:

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ج (الحشر۔۱۸)

"اور لازم ہے کہ ہر شخص یہ دیکھتا رہے کہ اس نے کیا توشہ آئندہ کل کے لیے بھیجا ہے۔"

فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق:

حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ

"جنت ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں اور دوزخ شہوتوں سے گھری ہوئی ہے۔" (مسندِ احمد۔ مسلم شریف)

بخاری شریف کی ایک اور حدیثِ مبارکہ دیکھیے:

اَحَبُّ الصَّلٰوةِ اِلَى اللهِ صَلٰوةُ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاَحَبُّ الصِّيَامِ اِلَى اللهِ صِيَامُ دَاوُدَ وَكَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُوْمُ ثُلُثَهُ وَيَنَامُ سُدُسَهُ وَيَصُوْمُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا

"سب نمازوں میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ نماز داوٗدؑ کی نماز ہے اور روزوں میں بھی داوٗدؑ کا روزہ۔ آپ آدھی رات تک سوتے اس کے بعد تہائی رات نماز پڑھنے میں گزارتے۔ پھر رات کے چھٹے حصے میں بھی سو جاتے اسی طرح آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔"

اس حدیثِ مبارکہ کے مطابق پیغمبر صاحبِ زبور بھی دراصل ایسے سالک تھے جو فراوانیٔ مال کے باوصف بارگاہِ تعالیٰ میں مجاہدہ کیا کرتے۔

عبادات ومجاہدات میں شدید توجہ لطف واحسان کا موجب ہے۔ کون جانے کس آن دریائے رحمت جوش میں آ جائے اور کناروں پر کھڑے سائل انمول موتیوں سے نواز دیے جائیں جبکہ اس بحرِ زخّار کے شناور کی تو شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اسی لیے صُوفیاء نے اپنی زندگیاں مجاہدات وریاضت میں صرف کیں اور خوشنودئ باری تعالیٰ کے جزاوار ہوئے۔ راقم کے پاس بہت سے ایسے لوگ آتے ہیں کہ اہلیت رکھتے ہیں، ان کی قلبی کیفیت بھی بہت خوب ہوتی ہے مگر مجاہدہ و ریاضت سے گھبراتے ہیں۔ یہ سہل پسندی انہیں منزل سے ہمکنار کرنے کی بجائے راستوں کی غذا بنا دیتی ہے اور وہ اس حقیقت سے آشنا ہی نہیں ہو پاتے ........ "کہ یہ راستہ کوئی اور ہے"۔ شوقِ عبادت ومجاہدہ ہی اکسیر ہے جو روحانی بالیدگی اور آئینۂ قلب کی صفائی کا فریضہ ادا کرتا ہے۔

مجاہدات وعبادات کے علاوہ احترام وعقیدت اور سچی اطاعت ایسے ذرائع ہیں جن کے باعث ایک سالک نگاہِ شیخ سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ و سالک کا علمی مرتبہ بھی حقیقتِ کاملہ کی طلب میں معاون ٹھہرتا ہے۔ اسلامی تصوف کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ صوفیائے کرامؒ نے اس معاملہ میں بہت کاوش وکد سے کام لیا ہے۔ حضرت ابو طالب مکیؒ نے "قوت القُلوب" کی دوسری جلد میں حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

> "میں نے پہلے حدیث وفقہ کا علم حاصل کیا پھر حضرت حارث المحاسبیؒ سے 'کتاب الرعایہ' کا درس لیا جس کے باعث کامیابی ہوئی۔ سو وہ شخص جو قرآن وحدیث کا علم نہ رکھتا ہو اسے دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اللہ اکبر، کیا مقام اور کیا احتیاط ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بھی درس ہے جو تصوف کے نام پر امت کو ظلمات کی طرف لیے جاتے ہیں۔ حضرت حارث المحاسبیؒ کی احتیاط پسندی اس سلسلہ میں ایک مثال ہے کہ محض اس لیے اپنے والد کے ترکے

سے دست بردار ہو گئے کہ والد مجوسی تھے۔ آپؒ کی یادگار تصنیف 'الرعایہ' آج بھی طالبانِ حق اور جویانِ خیر کی رہنما ہے۔ فقیر نے یہ کتاب اپنے شیخ کے ہاں دیکھی تو آپؒ کی اجازت سے کچھ عرصہ اس نسخے سے استفادہ کیا، خصوصاً ندامت اور اعمال کے ابواب سے خوب فائدہ اٹھایا۔ بعد میں جب روحانی ملاقات ہوئی تو حضرت محاسبیؒ نے بہت شفقت فرمائی۔

یوں تو قرآنِ کریم کی ایک ایک آیتِ مبارکہ مومنین اور سالکین کے لیے مینارۂ نور ہے جس کی روشنی دلوں کو منوّر اور جہانوں کو مسخّر کرتی ہے مگر 'سورۃ مزمل' اس ذیل میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ فقیر اس سورۃ کو تصوف کا منشور (Manifesto) سمجھتا ہے کہ یہ نکتہ بہ نکتہ اولیاء کے طرزِ حیات سے معمور ہے۔ مصنف 'تاریخِ تصوف' نے بہت خوبصورتی اور جامعیت سے اس کی تشریح فرمائی ہے البتہ راقم کو تائیدِ ربانی کی بدولت مزید نکات کا فہم بھی عطا کیا گیا۔ توفیقِ الٰہی سے مجھ پر کھلا کہ " قُمِ الَّیۡلَ " سے مراد عشاء کے تین گھنٹوں بعد قیام کرنا ہے۔ یہ حکم صرف اس لیے صادر ہوا کہ دینِ اسلام انسان کو اپنی جسمانی صحت کا خیال رکھنے کی بھی تاکید کرتا ہے۔

وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ؕ

"اور دھیرے دھیرے (ٹھہر ٹھہر کر) قرآن پڑھا کرو۔"

احکاماتِ ربّانی پر عمل پیرا ہونے کے لیے قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھنا از حد ضروری ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں رُک رُک کر پڑھنے کی تلقین کا سبب بھی یہ ہے کہ تفہیم کی جانب توجہ رہے۔ حضرت امام حسنؓ اور حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ کی روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ آہستہ آہستہ پڑھو تاکہ سمجھ سکو۔ اسی طرح کتبِ سیرت میں مرقوم ہے کہ آپؐ کوئی بھی بات، بعض اوقات تین تین مرتبہ ارشاد فرماتے تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلاً ○

"بے شک رات کو اٹھنا (نفس پر) قابو پانے کے لیے بہت ہی کارگر ہےاور پڑھنے (ذکر) کے لیے بہت ہی خوب وقت ہے۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ بے شک رات کا قیام نفس کشی اور یادِ باری کے لیے بہترین ہے۔ نفس کشی مسافتِ سلوک میں بنیادی رکن کا درجہ رکھتی ہے اور ذکرِ الٰہی اس منزل تک رسائی کا لازمی وسیلہ ہے۔ یہاں نفس کشی کے حوالے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ حقیقی صوفی نفس کو مفقود نہیں بلکہ معدوم سمجھتا ہے۔ مفقود (غائب) ہونا اس بات کا آئینہ دار ہے کہ اہلِ نفس کے لیے، نعوذ باللہ، اللہ کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے یعنی نفس ابھی زندہ ہے جبکہ معدوم (فنا) ہونا اس امر کا غماز ہے کہ نفس کا وجود باقی نہیں رہا سو رضائے ربانی اور حکمِ باری تعالیٰ کی بلا تامل پیروی کی جائے اور یہ بھی کہ ہمارا ہر قول و فعل محض اللہ کو حاضر ناظر مان کر ترتیب پائے۔ خواہش کا اظہار نفس کو زیب ہی نہیں دیتا کیونکہ سب سے بڑی خواہش قرب اللہ ہے، باقی سب کچھ ہیچ۔ دیگر آرزوؤں کی موجودگی میں حقیقت کا انعکاس دشوار ہو جاتا ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ میں معدوم ہوں وہ یہ بھی جانتا ہے کہ صرف اللہ موجود ہے لیکن اس کا علم محض عقل سے نہیں بلکہ عرفان سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تصوفِ اسلامی کا امتیاز اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ مشائخ اپنے شاگردوں کو شدت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی کی تاکید کرتے ہیں۔ گزشتہ سطور میں قرآن کی دو آیات کا حوالہ آیا کہ ربّ العزت اپنے محبوبؐ کو جہدِ عبادت کی تلقین فرماتے ہیں، گویا رات کا قیام اور ذکرِ الٰہی حکمِ ربانی کے علاوہ سنتِ نبویؐ بھی ہے۔ اس سورۃ کی اگلی آیت فقیر کے نزدیک سورۃ کا قلب ہے۔ اس کے طفیل دورانِ سیر الافلاک عنایات کی بے پناہ بارش ہوئی۔ مختصراً یہ کہ مذکورہ آیت، اللہ کی عظمت کا اظہار، انسان کا مقصدِ حیات اور ایک مومن کا مطمعِ نظر ہے:

وَاذْكُرِاسْمَ رَبِّكَ

''اور اپنے پروردگار کو (باقاعدہ) نام لے کر یاد کر۔''

اسمائے باری تعالیٰ اور صفاتِ الٰہی میں بے شمار اعزاز پوشیدہ ہیں۔ ذکرِ اسمِ ذات یعنی خالقِ کائنات کو اس کے ذاتی نام سے پکارنا گویا تمام صفتوں کا قلبی وقولی اعتراف کرتے ہوئے اقرارِ کلی کا حامل ہونا ہے۔ اقرارِ قولی، اقرارِ فعلی، اقرارِ وجودی، اقرارِ سری، اقرارِ عینی، اقرارِ قلبی سب اقرار کی اقسام ہیں تاہم اقرارِ کلی کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اصطلاحِ تصوف کی رُو سے اسمِ ذات کی مُداومت ذِکر کہلاتی ہے۔ دنیاوی دوڑ دھوپ اور غفلت ومعاصی کے گرد وغبار سے دل کے آبگینے دھندلا جاتے ہیں اور انسان شکرگزاری اور یادِ الٰہی کے باب میں کوتاہی وکاہلی کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔ یہ روش گمراہی کی بنیاد اور اللہ سے دوری کا نقطۂ آغاز ہے جس کا انجام دیارِ دل پر مایوسی وندامت کے مستقل پڑاؤ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں اس صورتِ حال کی نشان دہی فرماتے ہوئے اس کا علاج کچھ یوں تجویز کیا گیا ہے:

اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبُ تُصَدَّاُ كَمَا يُصَدَّاُ الْحَدِيْدُ فَاجْلُوْهَا بِذِكْرِاللهِ

''دلوں پر لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے پس دلوں کو اللہ کے ذکر سے روشن کرو۔'' (شعب الایمان)

گویا روح کی کثافت اور دلوں کی تیرگی دور کرنے کا نادر ترین نسخہ ذکرِ الٰہی ہے اور اس کی لَو کائنات کے جس ذرے تک پہنچے اسے منور کر کے زندگی بخش دیتی ہے۔ جب اسمِ ذات کی تجلیات ذاکر کے دل پر وارد ہوتی ہیں تو رفتہ رفتہ اس کی صفات وبرکات سالک کے روح وبدن میں سرایت کرتی چلی جاتی ہیں، یوں اُس کی شخصیت کچھ اِس انداز سے نمو پاتی ہے کہ باطنی تطہیر اُس کے انگ انگ سے چھلکتی اور جسم وجاں سے پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ یہی روحانی کیفیت قلب کا جاری ہونا کہلاتی ہے کہ ہر آن ذاتِ واحد کا دھیان سالک کے دل میں فروزاں رہے۔ اسی لئے نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

"احسن ترین عمل یہ ہے کہ جب تو دنیا سے رخصت ہو تو تیری زبان اللہ
کے ذکر سے تر ہو۔" (صحیح بخاری)

صوفیاء کے ہاں ذکر کئی طریقوں سے رائج ہے جن میں سے ذکرِ جہر، ذکرِ پاس انفاس، ذکرِ نقش، ذکرِ خفی اور ذکرِ یادداشت نسبتاً زیادہ معروف ہیں لیکن اس حوالے سے رسولِ کریمؐ کی رہنمائی حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِي "سب سے بہتر ذکر، ذکرِ خفی ہے۔" (مسندِ احمد)

ذکر سے دوری نافرمانی کی طرف لے جاتی ہے اور نافرمانی ابلیس کا راستہ ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ پاک ہے:

مَا اَحَبَّ اللّٰهَ مَنْ عَصَاهُ "نافرمانی کرنے والا اللہ سے محبت نہیں کرتا۔"

جب کہ ذاکرین کو ان الفاظ میں نویدِ خیر سے نوازا گیا ہے:

"جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ان میں سے ایک صرف ذاکرین
کے لیے مخصوص ہے۔" (حضرت عبداللہ بن عباسؓ)

بخاری شریف کے ایک اور فرمانِ مبارکہ میں یوں خوشخبری سنائی گئی ہے:

"اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا جس نے
تنہائی میں اللہ تعالیٰ کا ایسے ذکر کیا کہ اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔"

سو قارئینِ محترم! اس سے پہلے کہ یہ سازِ ہستی بے صدا ہو جائے، ذکرِ خفی قلبی کو معمولِ حیات بنالیں تاکہ اللہ کی محبت کو استحکام اور دوام حاصل ہو۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ٥

"اور دنیا کے معاملات سے قطع ہو کر اپنے پروردگار کو یاد کرو۔"

اس آیہ کی تفہیم میں یہ احتیاط لازم ہے کہ اسے ترکِ دنیا سے نہ جوڑا جائے۔ اللہ پاک نے یہاں فقط یہ فرمایا ہے کہ راجع پر لازم ہے کہ جب عبادت کرے تو اپنی

ذات سمیت ہر خیال کو یکسر بھلا دے۔ تاریخ میں کتنے ہی واقعات ہیں جو غازیوں کی نماز میں محویت پر شاہد ہیں۔ کسی کو بچھو نے کاٹا مگر نماز قطع نہیں ہوئی، کسی کے تیر لگا مگر خشوع وخضوع میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ کسی کا گلا کٹا مگر مجال ہے کہ سر سجدے سے اٹھا ہو، یہ ہے 'تَبَتَّل' یعنی:

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم

کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

کی عملی تصویر۔ اگلی آیت میں اللہ کی کارسازی کی طرف اشارہ ہے:

فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝ "صرف اللہ کو اپنا وکیل بنا۔"

اللہ ہی عادلِ مطلق ہے، یومِ جزا وسزا کا مالک۔ عین اور غیر عین سے ماورا ہوتے ہوئے بھی شاہد۔ سالک جب اپنے شیخ کی بیعت کرتا ہے تو اس کے معاملات مختلف وسیلوں سے ہوتے ہوئے بارگاہِ ایزدی تک پہنچتے ہیں۔ پہلا وسیلہ شیخ ہے جو اگر کامل ہے تو اپنی لیاقت وفراست سے صدیوں کا سفر چشم زدن میں طے کرا دے۔ الحمدللہ راقم کے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ کی نگاہِ التفات نے کئی بار اس نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا۔ میں نے آپؒ کو اس حدیثِ مبارکہ کی تفسیر پایا:

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَهُوَ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ (ترمذی شریف)

"مومن کی فراست سے ڈرتے رہو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

اللہ کا یہ نور بہت ارفع انعام اور عظیم عطا ہے جس کے بارے میں واضح ارشاد ہے:

يَهْدِي اللهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط

"اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔" (النور۔ ۳۵)

کارسازیٔ باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سندِ نجات نہیں، ذاتِ احد کو وکیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ سالک سے متعلق ہر عمل کا ثبوت اور دلیل دفترِ حق میں مرقوم ہے۔

سالک جب اپنے شیخ کی بیعت کے عمل سے گزرتا ہے تو گویا اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے ربِ کریم کو سب سے بڑا عادل اور حفاظت کرنے والا تسلیم کر لیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝ (المؤمن۔۱۲)

"اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر ہی کا ہے۔"

یوں سالک انسانی تحویل ترک کرتے ہوئے اس نکتے پر ایمان لے آتا ہے کہ تمام اختیار صرف اور صرف رب العالمین کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ بادیۂ عرب کا فصیح اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے:

وکلت الی المحبوب امری کله

فان شاء احیانی وان شا اتلفا

"میں نے اپنا کام محبوب کے سپرد کر دیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔"

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نبی کریمؐ، صحابہ کرامؓ اور تمام اکابرینِ امتؒ کے شب و روز سخت کوشی اور کارِ مسلسل سے عبارت ہیں۔ تقدیر کے دھوکے میں تدبیر سے منہ پھیرنے اور غیر سنجیدگی، کام چوری اور دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکّل نہیں بلکہ یہ سراسر خود فریبی، نفس پرستی اور شیطانی وسوسہ ہے۔ قانونِ قدرت ہے کہ محض انتظار کرنے والوں کو وہی کچھ ملتا ہے جو کوشش کرنے والوں سے بچ رہتا ہے۔ اسی لیے دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ سو دل کو آلائشِ حُبِ دنیا سے بچا کر حصولِ مقصد کی تگ و دَو میں مصروفِ عمل رہتے ہوئے فیصلہ اللہ کے سپرد کر دینا سالک کی پہچان ہے اور اسبابِ ظاہری کے پردے میں مسبّب الاسباب اور مفتح الابواب کی طرف یہ مراجعت ہی دراصل توکل ہے۔ اگلی آیت میں فرمایا گیا:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ

"اور غیروں (جو الگ مذہب رکھتے ہوں) کے اعتراضات پر صبر سے کام لو۔"

دشنام طرازی و بہتان پر خاموشی اور فضول گوئی و عیب جوئی سے اجتناب ربِ کریم کا حکم اور سالکین کی روش ہے۔ مولانا رومؒ نے کسی شخص کے سوال پر کہ آپؒ سب فرقوں سے متفق ہیں اثبات میں جواب دیا تو سائل نے آپؒ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ اگرچہ محفل میں حضرتؒ کے بہت سے شاگرد موجود تھےلیکن آپ نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار فرمالی کہ میں اپنے حوالے سے تمہارے خیالات پر بھی متفق ہوں۔ عارفِ کامل فضول گفتگو اور لایعنی اعتراضات کو صبر سے برداشت کرتا ہے۔ اوراقِ تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات موجود ہیں کہ اہل اللہ کو ہر قسم کی ایذا دی گئی مگر وہ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے طریق پر قائم رہے۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ○

"اور نفاست سے کنارہ کشی اختیار کرو۔"

نبی کریمؐ کی ہجرت اس امر کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آپؐ نے خلقِ عظیم کا نمونہ دکھاتے ہوئے کنارہ کشی فرمائی آپؐ کے اصحابؓ کبھی حبشہ گئے کبھی شعبِ ابی طالب میں بھوکے پیاسے پناہ گزیں رہے اور کبھی مدینہ کا سفر اختیار فرمایا۔ ہجرت انبیاء کی سنت اور اولیاء کا ورثہ ہے، امرِ ربّانی کی تعمیل میں ہجرت کرنا اجرِ عظیم کی جانب جانا ہے۔ یاد رہے کہ ہجرت محض ایک مقام سے دوسری جگہ جا بسنے کا نام نہیں، یہ ایک کثیر الجہت اصطلاح ہے۔ حکمِ شیخ کے تحت خود کو ذہنی و رُوحانی طور پر تبدیل کرنا بھی ہجرت ہے۔ شر سے منہ موڑ کر خیر کی طرف مراجعت، دروغ گوئی سے راست بازی کی سمت سفر اور کفر سے دستبردار ہو کر دین کے دامنِ عافیت میں پناہ لینا بھی ہجرت ہی کا ایک فکری پہلو ہے۔ فرمانِ نبویؐ میں ہجرت کا ایک مختلف اور زیادہ کشادہ رخ دکھایا گیا ہے:

"عہدِ بلا میں عبادت کرنا میری طرف ہجرت کرنے کے مترادف ہے۔" (صحیح مسلم)

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِيْنَ

"اور انکار کرنے والوں (جھٹلانے والوں) سے مت الجھو۔"

آپؐ نے جب اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق پیغامِ اسلام عام کیا تو خونی رشتہ دار تک آپؐ کے درپے ہو گئے مگر یہ استقامت ہی تھی کہ تکذیب کرنے والوں نے بھی ہمیشہ اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھوائیں۔ اولیائے کرامؒ نبی کریمؐ کے وارثانِ حقیقی ہیں جو ہر دور میں بادِ مخالف کے باوجود اخلاقِ طیبہ کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا کے سامنے امن کے دیپ جلانے اور محبتوں کے گلاب کھلانے میں مصروف رہے۔

یہ فقط فضلِ باری تعالیٰ ہے کہ تصوف کے ثبوت میں قرآنِ کریم کی آیات نصرت کا باعث بنیں۔ بادۂ رحمٰن کی مستی کہتی ہے کہ مے خانۂ احمدیؐ سے بھی دو چار جرعے اس مد میں لیے جائیں تا کہ دلائلِ قاطع کے ساتھ صیہونی پراپیگنڈے کی تردید و تنسیخ ہو سکے۔

بخاری شریف، جلد اول میں معرفتِ الٰہی کی ذیل میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی یہ روایت درج ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

قَوْلَ النَّبِيُّ اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللهِ وَاَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ

"میں سب سے زیادہ اللہ کا جاننے والا ہوں اور معرفت دل کا فعل ہے۔"

ابنِ رجب حنبلیؒ کے مطابق ایک حدیث شریف میں مقامِ ولایت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

مَنْ رَّكَعَ اِلٰى مَوْلٰى وَمَالَ اِلَيْهِ اَحْرَقَهُ اللهُ بِنُوْرِهٖ حَتّٰى يَصِيْرَ جَوْهَرًا لَا قِيْمَةَ لَهٗ (جامع العلوم، ص ۳۹۸)

"جو اپنے اللہ کی طرف جھکتا ہے اور اس کی سمت مائل ہوتا ہے تو اللہ اُسے اپنے نور سے جِلا دیتا ہے تا آنکہ وہ ایک انمول موتی بن جائے۔"

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے حوالے سے عجلانیؒ نے "کشف الخفاء" میں ایک واضح حدیثِ مبارکہ نقل کی ہے:

اَلشَّرِیْعَتُ اَقْوَالِی وَالطَّرِیْقَتُ اَفْعَالِی وَالْحَقِیْقَتُ اَحْوَالِی وَالْمَعْرِفَتُ اَسْرَارِی

"شریعت ہمارے فرمان ہیں، طریقت ہمارے افعال ہیں، حقیقت ہمارے احوال ہیں اور معرفت ہمارے اسرار ہیں۔"

حضرت داتا گنج بخشؒ کی تصنیفِ لاجواب میں نقل کردہ حدیثِ مبارکہ

مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَھْلِ التَّصَوُّفِ فَلَمْ یُؤْمِنْ عَلٰی دُعَاءِھِمْ کُتِبَ عِنْدَاللهِ مِنَ الْغَافِلِیْنَ

"جس نے اہلِ تصوف کی ندا سنی اور اس پر کان نہ دھرا، اللہ کے نزدیک اس کا شمار غافلوں میں ہوگیا۔" (کشف المحجوب۔ بابِ تصوف)

سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ طریقِ صوفیاء ہی تقویٰ اور پرہیزگاری کا راستہ ہے۔

اگرچہ سطورِ بالا میں معترضینِ تصوف کا تسلی بخش جواب دیا جا چکا ہے تاہم منہاجِ محمدیؐ پر یقین رکھنے والا کوئی عاشق و سالک جاننا چاہے کہ نامور صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظامؒ نے تصوف اور صوفیاء کے باب میں بطور تعریف کیا رقم فرمایا ہے تو اس کی تشفّی کے لیے بھی ناقابلِ تردید شہادتیں موجود ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول جو کہ بخاری شریف کی ایک حدیثِ مبارکہ کا عکس ہے:

"ولی اللہ وہ ہے جس کو دیکھنے سے اللہ یاد آجائے۔"

حضرت ذوالنون مصریؒ بہت برگزیدہ اور عظیم رتبے کے اولیاء میں سے ہیں۔ آپؒ سے دریافت کیا گیا کہ صوفیاء کون لوگ ہیں تو آپؒ نے فرمایا:

”وہ لوگ جو سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ انھیں سب چیزوں سے زیادہ پسند کرتا ہے۔“ (تاریخِ تصوف در اسلام، ص ۱۹۸)

جنابِ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نظر میں:

”تصوف قلب کو تمام کدُورتوں سے پاک کرنے کا نام ہے۔“ (مناقب العارفین)

حضرت سہل بن عبداللہ تُستریؒ کے نزدیک:

”صوفی وہ ہے جو کدورت سے صاف ہو، تفکر سے پُر ہو، اللہ کے قرب میں بشر سے علیحدہ ہو اور اس کی آنکھ میں خاک و زر یکساں ہو۔“ (ذکرِ جمیل، ص ۳۱۲)

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ صوفی خود کو مٹا کر حیاتِ دائمی حاصل کرتا ہے:

**هو ان يميتک الحق عنک يحيد به**

”صوفی اپنی ذات میں فانی اور ذاتِ حق میں باقی ہوتا ہے۔“ (رسالہ قشیریہ، ص ۱۲۶)

حضرت معروف کرخیؒ کی رائے میں:

”صوفی وہ ہے جو اللہ ہی سے تعلق رکھتا ہو، اللہ کا تصور کرتا ہو اور اللہ ہی سے محبت کرتا ہو۔“ (مناقب العارفین)

حضرت ابوالحسن نوریؒ کے مطابق:

”صوفیاء ایسی جماعت ہیں کہ ان کی جانیں بشری کدورت سے مبرّا ہو گئی ہیں نفس کی آفتوں سے محفوظ ہو چکی ہیں اور ہوا و ہوس سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہیں۔ سب سے اعلیٰ منزل میں حق تعالیٰ کے ساتھ امن میں ہیں اور غیر اللہ کے خیال سے دور ہیں۔“

(تصوف اور سریت، ص ۱۱۷)

حضرت امام غزالیؒ نے اپنی کتابِ لاجواب 'المنقذ من الضلال' میں فرمایا کہ:

”جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیاء کے طریق کی جانب متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ان کے علم کا حاصل نفس کی گھاٹیوں کو قطع کرنا

اور مذموم اخلاق اور صفاتِ خبیثہ سے پاک و منزّہ ہونا ہے تاکہ اس کے ذریعے دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے ذکرِ الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔"

معلوم ہوا کہ شیخؒ نے حکمِ شریعت کے عین مطابق راہِ تصوف اختیار کرتے ہوئے آئینۂ قلب کی صفائی کا اہتمام فرمایا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ 'عوارف المعارف' میں لکھتے ہیں:

**فلیعکم انا نعتی بالصوفیه المقربین**

"ہم صوفیاء کا مطلب مقربین ہی سمجھتے ہیں۔"

نزدیک ہونا قرابتِ محض نہیں بلکہ مقبولِ بارگاہِ ربانی ہونا ہے۔ قربِ باری تعالیٰ مومن کی معراج اور سالک کے لیے عید کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا حصول نہایت دِقت طلب کام ہے۔ اسی لیے ملائکہ کے علاوہ صوفیائے کرامؒ کو ہی مقربین کہا گیا۔ قرب اللہ دراصل قربِ مِن اللہ ہی ہے یعنی بغیر توفیق اور بنا اِذن اس کا حصول ناممکن ہے۔ قربت محض فاصلہ جاتی نہیں بلکہ سپردگی کا وہ مقام ہے جہاں سالک، ذاتِ کل کا اثبات کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں "تَقَرَّبُوْا، اَقْرَبُ، مُقَرَّبِیْنَ، قُرْب" کے کلمات جہاں بھی وارد ہوئے ہیں اثباتی ہیں، حیرت ہے کہ کسی مقام پر نفی مراد نہیں۔ یہ آیتِ مبارکہ:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ○ (ق۔۱۶)

"اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی بہت قریب ہیں۔"

دراصل "ہر جائی ہو" کا اعلان اور اس اثبات کی کامل دلیل بھی ہے۔

خواجہ حافظ شیرازیؒ نے اس مرحلے کو اور بھی باریکی سے طے کیا کہ قرب و بُعد اعیانِ ظاہرہ کو لازم ہے، عاشق پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بعد نیست
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

”عشق کے راستے میں دُوری اور نزدیکی کا معاملہ نہیں ہے۔ میں تجھے
ظاہراً دیکھ رہا ہوں اور تیرے لیے دعا گو ہوں۔“

میں نے ایک بار یہی سوال اپنے شیخِ مکرم حضرت باغ حسین کمالؒ سے کیا تو
آپؒ نے فرمایا:

”بیٹے! شریعت سراسر خوفِ الٰہی اور طریقت سراسر عشقِ الٰہی ہے۔
جس کے اندر یہ دونوں امور یکجا ہو جائیں وہ ولی ہوتا ہے۔“

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ تصوف وسلوک میں دل کو بنیادی مرتبہ حاصل ہے۔
ذکر ومراقبہ میں سانس کا زیر و بم اور مقامِ قلب کے عین درمیان اسمِ ذاتِ باری تعالیٰ
”اللہ“ کی ضرب سے پورا بدن جھنجھنا اٹھتا ہے۔ یہ عمل گویا سہ تار پرمضراب لگانا ہے
جس کے باعث تار میں لرزش ہی پیدا نہیں ہوتی سُر کی صدا بھی نکلتی ہے۔ ذکر مضراب
ہے، دل بجائے تار اور ان کے ملاپ سے جنم لینے والی صدا خیال۔ خیال، ذکر ومراقبہ
کا مدعا، انبساطِ قلب کا ذریعہ اور اللہ کی جانب لے جانے کا وسیلہ ہے۔ گویا خیال کی
طہارت اور نگرانی ہی تصوف ہے۔ مولانا رومؒ کی عظیم شعری تصنیف 'مثنوی معنوی' کا
آغاز اسی لطیف احساس سے ہوتا ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

”بانسری کی صدا اُس شکوہ سے بھری ہوئی ہے جو فراق کی داستان سے عبارت ہے۔“

خشک مغز و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

”تار، لکڑی اور کھال جو آلاتِ موسیقی بنانے میں استعمال ہوتے ہیں
جب کسی ساز کی صورت اختیار کر لیں تو آوازِ دوست نکلتی ہے۔“

اس شعر میں رومیؒ ذکر، قلب اور خیال کا بیان عمیق سطح پر فرماتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ موسیقی کی اصطلاح میں ''خیال'' اصیل گائیکی ہے۔ یعنی ایسا غِناء جس میں الفاظ کی ضرورت باقی نہ رہے اور ہر قسم کا اظہار سُروں کے ذریعے مخاطب تک پوری طرح پہنچ جائے۔ تصوف میں ''خیال'' سے مراد وہ رو ہے جو برق سے زیادہ تیز رفتار ہو اور سالک و شیخ کے درمیان رابطہ جوڑنے میں دیر نہ لگائے۔ علاوہ ازیں خیال کی اصطلاح دھیان اور معرفت کے لیے بھی مستعمل ہے۔ افصح الاولیاء حضرت عبدالکریم جیلانیؒ فرماتے ہیں:

ان الخیال حیات روح العالم　　هو اصل تیک وا صله ابن الأ دم

لیس الوجود سوی خیال عند من　　یدری الخیال بقدره المتعاظم

''خیال روحِ عالم کی حیات ہے۔ وہ ان کی اصل ہے اور اس کی اصل ابنِ آدم ہے۔ جو شخص خیال کی حقیقت کو قدرتِ عظیم جانتا ہے اس کے لیے وجود سوائے خیال کے اور کچھ نہیں۔''

پس معلوم ہوا کہ خیال، تصور نہیں بلکہ حقیقت کا اصل ہے جو مادی وجود نہ رکھنے کے باوجود نفسی اور نوری حیثیت سے سراسر موجود ہے۔ مادہ آلائشوں سے پُر اور کثیف ہے۔ ہر مادی شے کثافت سے بھری ہے مگر خیال غیر مادہ ہونے کے باعث کثیف نہیں، انتہائی لطیف جوہر ہے جو گراں نہیں گزرتا۔ دراصل خیال ہی زندگی کی حقیقت ہے۔

زندگی تے موت جوگی دونویں کوئی چیز نئیں

خیال نال موت اے خیال نال زندگی

فکر، الجواد، الغنی اور القوی سے رزق لیتی ہے اور وارِدِ کتب ہے کہ صرف فکرِ محمدیؐ کو پروردگارِ عالمین نے اپنے اسم ''الھادی الرشید'' سے خلق فرمایا۔ بعد ازاں اس پر

''الممیت المعید'' سے جِلا کی اور پھر اسے ''الباعث الشہید'' سے دیکھا۔ جب تمام اسماء کے اسرار یکجا ہوئے تو فکر نے صفاتِ عالیہ کے ساتھ عالم میں ظہور کیا۔ خیال فکرِ محمدیؐ ہی کا ایک حصہ ہے جسے اسمائے الٰہی سے اُجاگر کر کے ابدی روشنیاں عطا کی گئیں۔ صاحبِ 'انسانِ کامل' فرماتے ہیں:

''ربّ کائنات نے تمام زمینوں، آسمانوں اور فرشتوں کی ارواح فکرِ محمدیؐ سے خلق کیں اور مختلف مقامات پر ہر قسم کے اُموران کو سونپ دیے۔''

راقم کا مشاہدہ ہے کہ ہر زمانے میں تابعینِ عقل اس صفائیٔ باطن سے محروم رہے ہیں جو اہلِ یقین کو نصیب ہوئی۔ فقیر کے خیال میں عقلیت پسند ایمانِ اصلی سے عدم آگہی کے باعث محض عقل پر تکیہ کر لیتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اصل اصول کیا ہے جب کہ مراتبِ جنت اور عنایاتِ ربّانی اسوۂ محمدی ﷺ کا اِتباع کرنے والے عشّاق ہی کی وراثت ہیں۔ بقول حافظ شیرازیؒ:

اربابِ خرد ذوقِ مۓ عشق چہ دانند
''عقل والے، شرابِ عشق کا ذائقہ کیا جانیں''

نفسِ باطلہ کو شکست دے کر معبودِ حقیقی کی جانب لوٹنا صوفی کی حقیقی منزل ہے۔ سخاوت، پاکیزگی، مجاہدہ، خلوت، جہد فی سبیل اللہ، عدل فی الرعایہ اور اللہ کو پانے کے لیے بوقتِ ضرورت ارضی رشتوں سے جدائی وہ نشانیاں ہیں جو ولیٔ کامل سے ملزوم ہیں۔ یہی صفات ہیں جو ایک مومن کو درجۂ ولایت پر فائز کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اللہ کریم نے انبیاءِ کرامؑ اور اُن کے وارثانِ حقیقی اولیائے عظامؒ کو ان صفاتِ جمیلہ اور اوصافِ کریمہ کا مرقّع بنا کر دنیا کی پیشوائی کا فریضہ سونپا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا (السجدہ۔۲۴)

''اور ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو (سیدھی) راہ پر بلاتے تھے ہمارے حکم سے۔''

تصوف عشقِ الٰہی بھی ہے اور اظہارِ عبدیّت بھی۔ طلبِ صادق میں سالک اس حد تک آلائشوں سے مبرّا ہو جاتا ہے کہ اُسے خواہشاتِ رذیلہ کا خیال تک نہیں رہتا۔ ''رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی'' والا مصرع پورے سیاق وسباق کے ساتھ سالک پر چسپاں ہو جاتا ہے۔ ''تن میرا کل چشماں تھیوے'' کی مجازی تفسیر عرب کے معروف عاشق قیس المعروف مجنوں کی زندگی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت امام حسنؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ امام حسنؓ ہی نے ایک بار اس کی از خود رفتگی دیکھ کر فرمایا تھا ''اَنْتَ مَجْنُوْن'' یعنی تو مجنوں ہے۔ اسی باعث وہ مجنوں کے نام سے مشہور ہوا اور لوگ اس کا اصلی نام تک بھول گئے۔

مجنوں کی مذکورہ کیفیت اتصالِ حقیقی نہیں بلکہ فنا فی المقصود کی تھی اور فقیر اس کیفیت کو داخلِ تصوف نہیں سمجھتا تاہم خیال کرتا ہے کہ اگر اس جوہر کے حامل کا قلب واقعی رواں ہو جائے تو وہ بہت جلد منازلِ سلوک طے کر لیتا ہے۔ فقیر اُن حضرات سے متفق نہیں جو اس طرح کے خیالِ مجازی کو لازمۂ تصوف سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک اتنا کمال بھی مجنوں کو اس لیے نصیب ہوا کہ اس کی والدہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے دولت کدۂ تطہیر میں خدمت پر مامور تھیں۔ ساداتِ عظّام کسی کا حق اپنے پاس نہیں رکھتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اہلِ بیت کے ادنیٰ خدام بھی ایسی شان کے حامل رہے کہ سلاطین جن کے کفش بردار ہونے اور ان کے پاپوش آنکھوں سے لگانے پر فخر کرتے تھے۔ اگر قیس میں بذاتہٖ کوئی جوہر ہوتا تو وہ درجہ میں کہیں بلند ہوتا۔

ایک سچے عاشق کا مرتبہ تو یہ ہونا چاہیے کہ اس کی رضا محبوب کی رضا بن جائے۔ عشاق اصول سے سرِمُو انحراف نہیں کرتے۔ ان کا دل ایک ہی سمت مرتکز رہتا ہے۔ ظاہر بینوں کی نگاہ میں جو معاملات یکسر اہمیت نہیں رکھتے وہی اہلِ دل کے لیے وجد کا

سامان بن جاتے ہیں۔ انھیں ہر مخلوق کا حال یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ خود اسی نوع سے متعلق ہوں۔ قلبِ ماہیت محض فعل نہیں "من تو شدم تو من شدی" کا معاملہ ہے۔ تاہم حقیقت فی نفسہٖ تبدیل نہیں ہوتی بلکہ محدود مدت کے لیے عارضی طور پر منعکس ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جبریلِ امینؑ حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں تشریف لاتے تھے لیکن نہ تو جبریلؑ حقیقی طور پر حضرت دحیہؓ ہوئے اور نہ مذکورہ صحابیؓ درحقیقت جبریلؑ ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ حقیقت اصل کو قائم رکھتے ہوئے وقتی طور پر اپنا انعکاس کرتی ہے۔ اس عمل سے جوہر کو کچھ فرق نہیں پڑتا تاہم ظرف اور ظروف ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ پانی، پانی ہی رہتا ہے لیکن گھڑوں اور صراحیوں کی خشکی، تری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

درجاتِ عالیہ پر فائز عشاق کے قُلوب، برعکس ان کے جن کی بابت قرآنِ کریم خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کا امر صادر کرتا ہے، اَجْرُدُوبَرَهْنَہ یعنی شفاف اور آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ هُوَ الظَّاهِرُ اور هُوَ الْبَاطِنُ دونوں کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے اور انوارات کی معرفت کے تمنائی رہتے ہیں جو ربِ کریم کی طرف سے اپنے مومن بندوں کے لیے مخصوص ہیں۔ وہ رحمتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ یوں کرتے ہیں کہ قولِ الٰہی وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (میری رحمت ہر چیز میں شامل ہے) پوری طرح اپنی تجلّی کرتا ہے۔

جدید عہد میں تصوف کی تصویر کشی کچھ یوں کی جاتی ہے کہ مذہب اور معاشرے سے اس کی دوری باقاعدہ صفت محسوس ہوتی ہے حالانکہ قرآن و سنت میں جا بجا اس رویے کی حوصلہ شکنی اور نفی کے حوالے ملتے ہیں۔ اخوت، رواداری اور باہمی تعاون سے کرۂ ارض کی مثالی تشکیل اور اسرارِ کائنات سے ہم آہنگ ہو کر خالقِ کائنات کی حمد و ثنا کے نئے آفاق کی تلاش ہی انسان کا مقصدِ تخلیق ہے۔ یہ کام گوشہ نشینی کے ذریعے کسی

صورت ممکن نہیں۔علائقِ دنیا سے قطع تعلقی آپؐ کے قولِ مبارکہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ اور قوانینِ فطرت کا انکار ہے۔ربِ کریم کی عطا کردہ نعمتوں کا جائز اور مناسب استعمال تحدیثِ نعمت کی عملی شکل ہے جب کہ انعاماتِ ربانی سے منہ پھیر کر عزلت نشیں ہو جانا کفرانِ نعمت کی ذیل میں آتا ہے اور یہ کسی بھی طور ایک سالک کا شیوہ نہیں۔ صوفیاء کے نزدیک ترکِ دنیا محض نفسانی و دنیاوی خواہشات و ترغیبات کی اسیری سے گریز اور عاداتِ بد سے کنارہ کشی کا نام ہے۔اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سماجی و معاشرتی فرائض کی بجا آوری اور ایک دوسرے کی معاونت تصوف کا اولین درس ہے۔حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں:

”ترکِ دنیا یہ نہیں ہے کہ کوئی خود کو عریاں کر لے مثلاً ہندوؤں کی طرح لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ یہ ہے کہ لباس پہنے، کھانا کھائے اور جو اس کے پاس آئے اسے قبول کرے۔“ (فوائد الفواد)

تصوف دین اور دنیا کے درمیان توازن کا نام ہے۔تصوف کا مدّعا تعمیرِ سیرت و کردار، شخصیت سازی اور انسانوں کے مابین محبت، یگانگت اور خیر کا فروغ ہے تاکہ وہ دامنِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ اپنے معاملات بطریقِ احسن سرانجام دے سکیں۔اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ کریمہ طریقت کی اساس اور سب کا بھلا سب کی خیر تطہیر کا بنیادی فلسفہ ہے۔سالک جب اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دیتا ہے تو پہلا درس یہی ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ حُسنِ سلوک روا رکھتے ہوئے اعمالِ صالحہ کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا جائے۔اگر حُسنِ اخلاق کے ساتھ حُسنِ عمل نہیں تو بیعت کارِ زیاں اور تضیعِ اوقات ہے۔ دنیا کھیتی ہے اور نیک اعمال مثلِ بیج،جن کا پھل ہمیں آئندہ زندگی میں عطا ہوگا۔یہاں تک کہ میٹھا بول بھی اعمالِ صالحہ میں شمار ہوتا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ط (البقرۃ۔۲۶۳)

"خوش کلامی اور درگزر اس خیرات سے بہتر ہیں جس کے بعد ایذا دی جائے۔"

سرکارِ دو عالم ﷺ نے بھی حُسنِ اخلاق پر بہت زور دیا اور خود کو اخلاق کی تکمیل کرنے والا فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی بخاری و مسلم شریف کی ایک حدیثِ مبارکہ کے مطابق ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں یعنی عقائد و عبادات کے علاوہ معاملات و اخلاقیات بھی ایمان کے ستونوں میں شامل ہیں۔ رضائے الٰہی کی خاطر مخلوقِ خدا کے ساتھ خندہ پیشانی، معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآئی اور خود احتسابی اخلاقِ حسنہ کی راہ کا پہلا قدم ہے جبکہ خلوت و جلوت میں صحنِ دل کو اللہ کی یاد اور اس کی تجلیات و انوارات سے آباد رکھنا اس کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے موسمِ بہار میں ہر طرف شادابی و ہریالی جوبن پر نظر آتی ہے، چار سو رنگ و نور کے قافلے خیمہ زن دکھائی دیتے ہیں اور مست ہواؤں کے جھونکے خوشبوؤں اور مہکاروں کے سندیسے لاتے ہیں بعینہٖ حُسنِ سلوک، خوش خلقی، حقوق العباد کی ادائیگی اور خدمتِ خلق سے دل کِھل اٹھتا ہے اور عبادت زیادہ پر کیف اور سرور آفریں بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس خراب رویے کا حامل اور بے اخلاق ہمہ وقت بے چینی، بے سکونی اور خود ملامتی کے باعث نہ صرف لذّتِ طاعت و عبادت سے محروم رہتا ہے بلکہ زندگی کی ظاہری خوشیوں سے بھی پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا..... "اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا" (مومنوں میں کامل ترین ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہوں) اور تصوف حیاتِ انسانی میں اخلاقِ نبویؐ کی ترویج اور عملی تربیت ہی کا نام ہے یعنی اچھائی سے رجوع اور برائی سے اجتناب۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک باغبان زمین میں بیج بوئے اور کونپل پھوٹنے پر ہر آن اس

کی آبیاری اور تراش خراش پر توجہ مرکوز رکھے تو وہ ایک نخلِ سایہ دار کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ایسے ہی کامل شیخ ایک مرید کے دل میں اخلاقِ حسنہ کا بیج بوتا ہے اور اس کی مسلسل توجہ سے سالک اخلاقِ الٰہی اور خصائلِ نبویؐ کے گلستاں کھلاتا چلا جاتا ہے۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ کے مطابق:

"تصوف نہ رسم ہے نہ علم بلکہ سراسر اخلاق ہے۔ یعنی اگر لگا بندھا طریقہ ہوتا، کوشش سے حاصل ہو جاتا۔ اگر علم ہوتا، پڑھنے سے حاصل ہو جاتا۔ یہ تو اخلاق ہے کہ اپنے میں اخلاقِ الٰہی پیدا کرو۔"

اور یہ اخلاق پیدا ہوتا ہے اطمینانِ قلب سے۔ شرک، حسد، شک اور خواہشاتِ رذیلہ کو قرآنِ حکیم میں امراضِ قلب قرار دیا گیا ہے۔ ان ایمان لیوا بیماریوں سے ممکنہ بچاؤ اور شفایابی کے لیے غذائے قلب کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ لہٰذا قلبِ سقیم کو قلبِ سلیم میں تبدیل کرنے کی جہدِ مسلسل اور نفسِ مطمئنہ کے حصول کو ممکن بناتے ہوئے نفسِ راضیہ کی منزل تک رسائی سالک کی اولین ترجیح ہونی چاہیے تا کہ وہ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً (اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ الفجر، ۲۸) کے تحت شادکام ہو اور تادمِ آخر سلامتیٔ ایمان سے بہرہ مند رہے۔ اس حوالے سے قرآن و حدیث میں ایک آفاقی نسخے کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝

"یاد رکھو، دلوں کا سکون تو اللہ کے ذکر میں ہے۔" (الرعد۔۲۸)

ذِکْرُ اللّٰہِ شِفَاءُ الْقُلُوْب

"اللہ کا ذکر دلوں کے لیے شفاء ہے۔" (کشف الخفاء)

گویا اللہ کا ذکر ہی دِلوں کی شادابی، زرخیزی اور اطمینان کا سیدھا، واحد اور سہل راستہ

ہے۔ یہ متاعِ سکون انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی ہر سانس اسمِ ذات کی مالا جپنے میں صرف کر دیں۔ خیر، نور اور برکات کا یہ سلسلہ نبیٔ کریمؐ سے صحابۂ کرامؓ، پھر تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے صوفیائے کرامؒ تک پہنچا ہے۔ یہ ایسی نعمت ہے جس کی برکت سے روح شفاف اور باطنی غبار صاف ہو جاتا ہے، آئینۂ دل چمکنے لگتا ہے اور سالک اس میں انوارِ الٰہی کے کرشمے دیکھتا ہے۔ اسی لیے مومنین (مرد و زن) کو صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ٥

"اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔" (الاحزاب۔۴۱)

وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ٥

"۔۔۔اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مردوں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والی عورتوں کے لیے اللہ نے بخشش اور اجرِ عظیم تیار فرما رکھا ہے۔" (الاحزاب،۳۵)

جبکہ ذکرِ الٰہی سے غفلت برتنے والوں کو یوں وعید سنائی گئی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ٥

"اے ایمان والو! تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے اور جو غافل ہو گئے وہ (یقیناً) گھاٹے میں رہیں گے۔" (المنافقون۔۹)

جسمِ انسانی معجزۂ الٰہی ہے۔ اس میں جہاں ظاہری حواس کے لیے مختلف اعضاء ہیں وہاں روح کے حواس بھی ہیں جنہیں مقاماتِ نور یا لطائف کہا جاتا ہے۔ جب سالک اپنے شیخ کی صحبت میں پاکیزگیٔ ذات اور بالیدگیٔ نفس سے بہرہ ور ہوتا ہے تو لطائف کی تکمیل کے بعد سیرِ روحانی کا آغاز ہو جاتا ہے اور سالک عالمِ امر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قرآن و حدیث لطائف کے ذکر سے معمور ہیں اور وحی و الہام کی طرح یہ بھی نور

کی طرف سَمت نمائی کرتے ہیں۔ عالمِ امر اور عالمِ خلق کے لطائف کا مختصر اور جامع بیان کتابِ مبین میں یوں ہوا ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (النور۔۳۵)

"اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔"

سماء عالم امر اور ارض عالمِ خلق ہے۔ گویا گم گشتہ روحانیت کے حصول کے بعد وجودِ محض کو زائل کر دیا جائے تو ایک لطیف تعلق عالمِ امر سے قائم ہو جاتا ہے اور مظاہرات و عجائبات کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ حضرت ابومخذورہؓ کے بارے میں 'ابنِ ماجہ' کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے آپؓ کی پیشانی پر دستِ مبارک رکھا، پھر چہرے پر پھیرا، بعدازاں سینے سے ناف تک لے گئے۔ پھر آپؐ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ گویا یہ واضح ہوا کہ لطائف برحق بھی ہیں اور سنت بھی۔ لطائف کی تابندگی کا مرحلہ تصوف اور مراقبات کا سفر سلوک کہلاتا ہے۔ اس دوران روحِ سالک جن عالمین کا سفر طے کرتی ہے، اس کا مختصر تذکرہ یقیناً دلچسپی کا حامل ہوگا:

عالمِ ناسوت : یعنی عالمِ خلق، سلوک کی وہ ابتدائی منزل جسے عالمِ اجسام و محسوسات سے واسطہ ہوتا ہے۔

عالمِ ملکوت : ارواح اور ملائکہ سے متعلق ہفت افلاک پر مشتمل سفرِ سلوک کا دوسرا حصہ جہاں سالک مرتبۂ اخلاص پر پہنچتا ہے۔

عالمِ جبروت : راہِ سلوک کا تیسرا مرحلہ جو نو عرشوں کو محیط ہے۔ یہاں آزمائش کے بعد سالک اگلی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

عالمِ لاہوت : روحانی مسافت کا وہ اعلیٰ مقام جسے لامکاں اور عالمِ امر بھی کہتے ہیں۔ اس لامحدود منزل پر سالک تجلیٔ ذات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اس کے بعد روح ارفع ترین منازل کے سفر پہ روانہ ہو جاتی ہے جس کی انتہا پر سالک ذاتِ باری سے ہمکنار ہو کر اس کے رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں ربِ کائنات کا اعلان ہے کہ میں سالک کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے (بخاری شریف)۔ فقیر کو اگرچہ اس کے شیخ یہ تمام منازل طے کروا چکے تھے لیکن فرشی و عرشی مسافت سے قبل نبی کریمؐ نے بارِ دگر لطائف و مراقبات پر خصوصی توجہ فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ان لطائف کو قرآنِ مجید میں تحقیق کرو۔ خوش قسمتی سے متعلقہ آیاتِ مبارکہ ذہن میں تھیں سو آقائے دو جہاں ﷺ کی خدمت میں تلاوت کیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق۔۳۷)

''بے شک اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لیے جو قلب رکھتا ہے۔''

گویا قلب ذکرِ باری تعالیٰ کا مرکزِ صفات ہے۔ اس کی تطہیر ازحد لازم ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اسمِ ذات ''اللہ'' کی ضرب غیر اللہ کا عکس مٹا کر توحید کا نقش قائم کرتی ہے۔ یوں قرآن نے لطیفۂ قلبی یعنی پہلا لطیفہ کھول کر بیان کر دیا۔ لطیفۂ روحی ترتیبی اعتبار سے دوسرا لطیفہ ہے جس کے بارے میں قرآنِ مجید صریح بیان کرتا ہے کہ اللہ کا امر ہی روح کو اُستوار کرنے والا ہے:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل۔۸۵)

''(آپؐ) کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے۔''

یہاں روح بطور لطیفہ بیان ہوئی ہے جو اپنی بنیاد میں حکمِ ربّانی کے تابع ہے۔ سری، خفی

اور اخفیٰ بالترتیب تیسرا، چوتھا اور پانچواں لطیفہ شمار ہوتے ہیں۔ سری اور اخفیٰ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ (طٰہٰ۔۷)

"وہ چپکے سے کہی ہوئی بات اور نہایت پوشیدہ بھید تک کو جانتا ہے۔"

لطیفۂ سری اور اخفیٰ ظن وگمان اور غائب و ناموجود کو منسوخ کر کے اعتبار و یقین اور شاہد وظاہر کو تابندگی عطا کرتے ہیں جبکہ لطیفۂ خفی کتابِ ہدایت میں یوں بیان ہوا ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ (الاعراف۔۵۵)

"اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو۔"

یہ لطیفہ خبائث ورذائل کو رفع کرتا ہے۔ فقیر نے اس لطیفے میں بغض وحسد کو خوار دیکھا۔

عالمِ امر کے مندرجہ بالا لطائف کے علاوہ عالمِ خلق کے لطائف میں سے ایک وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (الشمس۔۷) کے تحت لطیفۂ نفس ہے۔ یہ چھٹا لطیفہ ہے اور عاجزی، حلم اور مناجات کے لیے اکسیر ہے۔ ساتویں لطیفے یعنی لطیفۂ قالبیہ (سلطان الاذکار) میں عالمِ امر اور عالمِ خلق کے تمام لطائف کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان لطائف کے منور ہونے پر روح وبدن میں ایسا وجد آفریں سماں پیدا ہوتا ہے کہ اسمِ ذات۔۔۔"اللہ" ہر بُنِ مُو سے چھلکنے لگتا اور سالک کے خون کا قطرہ قطرہ، رگ رگ اور بال بال ذاکر بن جاتا ہے۔

ہر لطیفہ مخصوص رنگ کے انوار وتجلیات کا حامل ہے اور اس کے فیوض و برکات کا تعلق ایک خاص آسمان اور وہاں پر متمکن ذی حشم انبیاءؑ سے ہے۔ حضرت باغ حسین کمالؒ لطائف کے مقامات، رنگوں اور متعلقہ آسمان و نبیؑ کی بابت اپنی تحقیق وتجزیے کا خلاصہ "حالِ سفر" میں یوں درج فرماتے ہیں:

''ان لطیفوں میں سے ہر ایک کو بدن کے بعض اعضاء سے ایک ربط و تعلق ہے۔ لہٰذا قلب کا تعلق بائیں پستان کے نیچے دو انگلی پر ہے اور روح کا ارتباط دل کے مقابلے میں دائیں پستان کے نیچے دو انگلی پر، سِری بائیں پستان کے اوپر، خفی دائیں پستان کے اوپر اور اخفیٰ کا مقام وسط میں ہے۔ نفس پیشانی پر اور سلطانُ الاذکار پورے جسم پر حاوی ہے۔ پہلے لطیفے کا رنگ زرد سرخ، دوسرے کا سفید، تیسرے کا سیاہ، چوتھے کا نیلا، پانچویں کا سبز اور چھٹے ساتویں میں سب رنگوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ پہلے لطیفے کا فیض حضرت آدمؑ سے متعلق ہے اور اس کے انوارات و برکات آسمانِ اوّل سے آتے ہیں۔ دوسرے کا حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور آسمانِ دوم سے، تیسرے کا حضرت موسیٰؑ اور آسمانِ سوم سے، چوتھے کا حضرت عیسیٰؑ اور آسمانِ چہارم سے اور پانچویں کا رسولِ اکرمؐ اور آسمانِ پنجم سے ہے۔ چھٹے اور ساتویں لطائف کے جاری ہونے پر چھٹے اور ساتویں آسمان سے انوار و برکات نازل ہوتے ہیں۔''

یہ جاننا بھی اہم ہے کہ اکابر صوفیاء لطائف کی تعداد اور ان کے انوارات و مقامات کے حوالے سے ہم خیال نہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے اکثر علماء کے نزدیک سورہ فاتحہ (۷) آیات پر مشتمل ہے جبکہ کچھ دیگر کا اصرار (۶) آیات پر ہے لیکن یہ علمی اختلاف بہر حال متن کو متاثر نہیں کرتا۔ بعینہٖ لطائف کے مقامات، انوارات کی رنگت اور تعداد کا فرق محض صوفیاء کے مکاشفاتی تجربے اور اندازِ بیان کے تفاوت کی وجہ سے ہے۔ فقیر کے خیال میں کسی بحث میں پڑنے کی بجائے حکمِ شیخ کے مطابق ذکر پر مداومت ہی لطائف کو روشن اور منور کرنے کا (چاہے ان کی تعداد جو بھی ہو) واحد ذریعہ ہے۔

شیخ کو چاہیے کہ دنیاوی جاہ و منصب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ محض مرید کے دل پر قائم رکھے اور اسے مراحل طے کرانے میں بہت احتیاط سے کام لے، بہر گام اس کے ہر قول و فعل کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت پر آنچ نہ آنے دے، اس کے اندر مثبت اندازِ فکر کی نمو پر توجہ مرکوز رکھے، اس کی روحانی ترقی کو اپنی کامیابی سمجھے، اسے زندگی کے ہر معاملے میں خوب و ناخوب کی تمیز کے قابل بنائے اور اس کے خوابیدہ اوصاف بیدار کرے۔ مزید برآں سالک میں ھَل مِن مَزید کی صفت اجاگر کرنا، اسے نظم و ضبط کا عادی بنانا اور خود احتسابی کے لیے تیار کرنا بھی شیخ کے فرائض میں شامل ہے۔ جب کہ ایک سالک کے لیے بس یہی تاکید ہے کہ بہر آن گفتۂ شیخ پر یقین رکھے، اس کی فرماں برداری کو فرض مانتے ہوئے اپنے ارادے اور مرضی سے دست کش ہو کر تعمیلِ ارشاد کے لیے ہمہ وقت تیار رہے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا یہ فرمان ذہن نشین کر لے:

"جس شخص نے شیخ کے جواب کا احترام ملحوظ نہ رکھا، وہ شیخ کے فیض سے محروم ہو گیا، اور جس نے شیخ کی بات کے جواب میں "نہیں" کہہ دیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔" (عوارف المعارف)

شیخ سے غیر مشروط اور ناقابلِ تنسیخ محبت ہی سرخروئی کی ضامن ہے لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سچے سالک کے برعکس ایک دنیادار کا اعتقاد بس اسی قدر ہوتا ہے کہ بغیر کسی امتحان سے گزرے من کی مرادیں پا لے۔ جہاں شیخ نے کٹھالی میں ڈالنے کا ارادہ کیا، سود و زیاں کے گوشوارے مرتّب کرتے ہوئے جھٹ سے رستہ تبدیل کر لیا۔ اکابر اولیائے کرامؒ اس امر پہ متفق ہیں کہ ایک بار شیخ کی توجہ اور دھیان سے دور ہونے والا دین کے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ جادۂ عشق میں

ادب، عقیدت، اطاعت اور استقامت کے بغیر استفادہ ممکن ہی نہیں۔ بعض اوقات برسوں کی مسافت کے باوصف طلب اور خواہشات میں تغیّر رشتوں کے انقطاع کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے سمت کا تعین اور ارتکاز ہمیشہ سالک کے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ مسافتِ عشق ...... ''دو چار دن کی بات نہیں، عمر بھر کی بات'' والا معاملہ اور ہر گھڑی سر انجام دی جانے والی سرگرمی ہے۔ اس سفر میں کامیاب وہی گردانا جاتا ہے جو خاتمہ بالخیر کا جز اوار ٹھہرے۔ یعنی:

پانی بھرن سہیلیاں رنگا رنگ گھڑے
بھریا اس دا جانڑیے جس دا توڑ چڑھے

طالبِ عشق کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جس قدر بھی بلند پرواز کیوں نہ ہو جائے اس کی ڈور بہرحال مرشد کے ہاتھ میں ہی رہتی ہے، وہ چاہے اُسے آسمانوں پہ اڑاتا پھرے چاہے تو کھینچ کے زمین پر لے آئے۔ شیخ کی توجہ اگرچہ تمام سالکین پر یکساں ہوتی ہے لیکن روحانی ترقی کا آسان اور مختصر ترین راستہ صُحبتِ شیخ ہے جس میں کمی بیشی کیفیات میں اتار چڑھاؤ کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک سالک اپنے شیخ کی محفل میں جتنا زیادہ حاضر باش رہے گا اسی قدر تیزی سے مسافتِ سلوک طے ہوگی اور اس کا دل مائل بہ عمل ہوگا۔ تاہم اخذِ فیض کے لیے طالب کا محض آرزومند اور متوجہ ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اعمال کے ذریعے طلبِ صادق اور استعداد کا اظہار بھی ضروری ہے۔ فیض شیخ کے پاس امانت کی طرح ہوتا ہے اور یہ امانت بلا سوچے سمجھے اور بغیر دیکھے بھالے کسی کے سپرد نہیں کی جاتی۔ جس نسبت سے مرید کی طلب بڑھے گی اسی تناسب سے شیخ کی توجہ اور عطا میں اضافہ ہوگا اور طالب کے دل میں جذب و انجذاب کی صلاحیت بڑھ جائے گی۔ توجہ انعکاسی، توجہ القائی اور توجہ اتحادی توجہ کے مختلف درجے ہیں لیکن ان

میں توجہ اتحادی سب سے زیادہ قوی، فائق اور پائیدار ہے۔ اس میں شیخ بھرپور انہماک سے اپنے روحانی کمالات طالب کی روح میں القاء کر دیتا ہے۔ یوں دونوں روحیں باہم جذب ہو جاتی ہیں اور من وتو کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس دورِ پُرفتن میں جہاں یہ توجہ دینے والے خال خال نظر آتے ہیں وہاں ایسے سچے طالب اور حقیقی ظرف والے بھی کم کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ الحمد للہ فقیر کو اس کے شیخ نے ایک خاص اور یادگار ملاقات میں سینے سے لگا کر تمام حجابات اٹھاتے ہوئے فرمایا:

"یادرکھنا میں نے تمہیں توجہ اتحادی سے نوازا ہے۔"

آپؒ طبعاً سخی تھے اس لیے اکثر ساتھی ابتداً فیض یاب تو ہوئے لیکن بہت کم گرم رفتار نکلے اور استقامت بھی چند ایک خوش نصیبوں کے حصے میں ہی آئی۔ شوق کے ساتھ اگر عمل میں ثبات نہ ہو تو سلوک وتصوف، روحانیت نہیں محض دکھاوا ہے۔

جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کے نتیجے میں بحکم الٰہی مدارج میں عروج یقینی ہے۔ اس مسافت کے دوران نہ صرف ایک روحانی سرمستی کا احساس ہر آن سالک کو شادمان رکھتا ہے بلکہ وہ

یہ ہمی ہیں جو تری یاد بسا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

کے مصداق کارزارِ حیات میں بھی زیادہ بہتر انداز سے بروئے کار آسکتا ہے۔ سوا سے ذکرِ الٰہی کے حوالے سے تغافل اور تساہل نہیں برتنا چاہیے۔ ذکرِ اسمِ ذات، لطائف، مراقبات اور منازلِ سلوک کا بنیادی مقصد نفسِ امارہ کو نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ میں تبدیل کرتے ہوئے نفسِ راضیہ کی منزل تک رسائی ہے۔ یہ "جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے" کی منزل اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے کا مقام ہے۔ فقیر محسوس کرتا

ہے کہ اہلِ خرقہ نے لطائف کو معمول کی حیثیت دے دی ہے حالانکہ طالب کی لیاقت ملاحظہ کیے بغیر یہ موتی لٹانا مناسب نہیں اور مرید کو بھی محض لچھے دار باتوں اور کھوکھلے دعوؤں سے خوش ہونے کی بجائے اپنی روحانی مسافت کا خود شاہد ہونا چاہیے۔ بقول حضرت اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ:

"صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں کہ پیر صاحب فرما دیں کہ لو تمھیں دربارِ نبویؐ میں پہنچا دیا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سالک خود مشاہدہ کرے کہ منازلِ سلوک طے کر رہا ہے۔" (دلائل السلوک)

مشاہدے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے مقامات کو دیکھے اور دوسری یہ کہ فرمانِ شیخ کو اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کرے۔ الحمدللہ راقم کے پاس متعدد ایسے حضرات آئے جنھوں نے جاگتی آنکھوں لطائف و مراقبات کے بعد دربارِ اقدسؐ میں باریابی کی گواہی دی اور کئی ایک اپنے اندر پاکیزگی کے بڑھتے ہوئے احساسات اور اپنی اُجلی کیفیات کے ذریعے اس مبارک سفر کے شاہد ٹھہرے۔

لطائف کی تابندگی سچّی طلب اور اطاعت سے مشروط ہے تاہم طلب، توفیق اور عطا کا معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ توفیق دراصل عطا ہی نہیں بلکہ ایک ذمہ داری بھی ہے۔ جو شیخ اس نکتے کو عملی سطح پر تابندہ کر دے وہی عارفِ کامل ہے۔ اگرچہ رویت اشکال اور کشف و کرامات وغیرہ صحیح اسلامی تصوف کا مقصود نہیں پھر بھی کبھی کبھار اس راستے کے مسافر کو رہنمائی اور اس کے یقین میں اضافے کے لیے یہ نعمتیں ضمناً عطا ہو جاتی ہیں لیکن یاد رہے کہ راہِ سلوک میں مقصود بالذات صرف اور صرف حصولِ رضائے الٰہی اور عشقِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ فقیر کو حضورؐ نے خلفائے راشدینؓ، حسنینِ کریمینؓ اور اکابر اولیائے کرامؒ کی موجودگی میں تمام لطائف اس

سبک رفتاری سے طے کرائے کہ پلک جھپکنا بھی ایک طویل دورانیہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہر لطیفے کی خصوصیت، مقام، رنگ اور کیفیت کے متعلق تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا۔۔۔۔ ''بیٹے، لطائف مراحلِ عشق ہیں جب کہ آپ کو بہت آگے جانا ہے۔'' الحمد للہ، فقیر نفسِ راضیہ کی آخری حد تک ہو آیا جہاں منشاء صرف حق ہے اور اسی کی حکمرانی عالمین کو محیط ہے۔ سالکین ہمیشہ یاد رکھیں کہ لطائف کی تابانی ایک چراغ کی مانند ہے جو راہ سجھائے، یہ محض پیش خیمہ ہے تصوف کا مقصود نہیں۔ دورانِ ذکر رنگوں کا مشاہدہ بعض حضرات کے لیے بڑی بات سہی لیکن سچا عارف اسے معمولی خیال کرتا ہے کیونکہ مقصد عینی وصلِ ذاتِ حق ہے۔ انسان کا اصل ارمان ہی یہ ہے کہ وہ ہجر کی طویل شاہراہ طے کر کے دائمی وصل سے بہرہ ور ہو گویا لطائف و مراقبات وسیلہ ہیں، طلب نہیں۔ فقیر کے نزدیک تصوف کا بنیادی مقصد حُبِ رسول ﷺ ہے جو عشقِ الٰہی کے راستے پر گامزن کرتی ہے۔ بخاری و مسلم شریف کی زینت یہ حدیثِ مبارکہ دراصل تصوف کا متن ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔''

بے شک نبیٔ کریم ﷺ کی محبت ہی مومن کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ وہ جب تک ہر شے کی محبت سے بے نیاز ہو کر آپ ﷺ کے عشق کا اسیر نہ ہو جائے، اسے کامل مومن و سالک نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ راقم اُن صاحبان سے متفق نہیں جو تصوف کی جڑیں یونانی اور ہندی تہذیب میں تلاش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبالؒ کا فرمان سند کا درجہ رکھتا ہے:

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نرسیدی تمام بولہبی ست

(خود کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں لے جا کہ وہی دین کی تفسیر اور مکمل دین ہیں بصورتِ دیگر تو وہاں نہ پہنچا تو بولہبی میں گھر جائے گا۔)

اگرچہ تمام الہامی و غیر الہامی مذاہب کے پیروکاروں میں نفس کشی کی محدود روایت اور تصوف کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں لیکن یہ روایت کسی صورت جامع اسلامی تصوف سے میل نہیں کھاتی جس میں ایک سالک 'از فرش تا عرش' رضائے حق سے ہم آہنگ ہونے کی تربیت پاتا ہے۔ سادہ لفظوں میں اسلامی تصوف آئینے کی سامنے سے جبکہ غیر اسلامی تصوف آئینے کی پشت سے صفائی کا نام ہے۔ ممتاز محقق اور صحیح اسلامی تصوف کے شارح ڈاکٹر زرّیں کوب نے اپنی کتاب 'ارزشِ میراثِ صوفیہ' میں ان مستشرقین کو مدلل جوابات دیے ہیں جو اسلامی تصوف کو کبھی مجوسیت سے ماخوذ بتاتے ہیں اور کبھی ہندومت سے۔ آپ لکھتے ہیں:

"......اسلامی تصوف غیر اسلامی مذاہب سے اس نوعیت کی شباہت کے باوجود نہ جزوی طور پر ان مذاہب سے برآمد ہوا نہ مجموعی اعتبار سے ان سے برآمد ہوا بلکہ اپنی ذات میں ایک مستقل شے ہے جس کا مخرج اسلام اور قرآن ہے اور اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں کہ بجز اسلام اور قرآنِ حکیم کے تصوف کے عناصر غیر اسلامی ہو ہی نہیں سکتے۔ (اس بحث سے) یہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور عہدِ حاضر میں یہی نظریہ بیشتر اہلِ تحقیق نے تسلیم کیا ہے۔"

ڈاکٹر غلام جیلانی برق بھی اسی نظریے سے متفق ہیں:

"......اسلامی تصوف نے عیسائی، ہندو اور بدھ راہبوں کو جنگلوں اور غاروں سے نکال کر انسانی بستیوں میں لا آباد کیا۔ انہیں زندگی کی جائز لذتوں مثلاً نکاح، کھانا پینا

وغیرہ سے متمتّع ہونے کی اجازت دی۔ فاقہ کشی، نفس کشی اور جسمانی اذیتوں سے بچایا اور انسانوں میں رہنا سکھایا۔ یورپ میں آج بھی بڑے بڑے صوفی، راہب اور پادری موجود ہیں لیکن نفس کشی، غار نشینی اور خود اذیتی کا وہ قدیم سلسلہ باقی نہیں رہا اور یہ اثر ہے اسلامی تصوف کا۔" (یورپ پر اسلام کے احسان)

بات دراصل یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیش رو اپنی کتابوں میں نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں موجود پیش گوئیاں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ ان کے پاس کلامِ الٰہی کی تردید کا تو کوئی ثبوت نہیں ہوتا لیکن اپنی جلن مٹانے کے لیے انھیں بار بار صوفیاء کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دائرۂ اسلام میں الحمدللہ ایسے اذہان موجود رہے ہیں جو اِن فتنہ پردازوں کے ہاتھ اور زبان روکنے کے لیے کافی ہیں۔ ماضیٔ قریب میں حضرت مہر علی شاہؒ، حضرت مولانا اللہ یار خانؒ اور حضرت باغ حسین کمالؒ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے تحریری اور تقریری ہر دو سطحوں پر منفرد کام کیا جبکہ ان حضرات سے پہلے اور بعد میں بھی اس میدان میں کام کرنے والوں کی کمی نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'ہمعات' میں تصوف اور اہلِ تصوف کی اسلامی حیثیت واہمیت یوں واضح کی ہے:

"جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا تو آپؐ سے حفاظتِ دین کا جو وعدہ کیا گیا تھا، آپؐ کی وفات کے بعد اس وعدہ کی حفاظت کی دو شکلیں پیدا ہوئیں۔ وہ بزرگ جن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی حفاظت کی استعداد ملی تھی وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہا، محدثین، نمازیوں اور قاریوں کی جماعت ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اہلِ ہمت کی یہ جماعت مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ دین کی تحریف کی اگر کہیں کوشش ہو تو یہ لوگ اس کی تردید میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دین

کا دوسرا گروہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے باطنِ دین، جس کا دوسرا نام "احسان" ہے، کی استعداد عطا فرمائی۔ ہر زمانے میں اس گروہ کے بزرگ عوام الناس کا مرجع رہے ہیں۔ طاعت و نیکوکاری کے اعمال سے باطنِ نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور دلوں کو ان سے جو لذت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں نیز یہ انھیں نیک اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔"

حضرت باغ حسین کمالؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حالِ سفر" صفحہ ۵۵ میں رقم طراز ہیں:

"...... گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دو انداز اختیار فرمائے۔ ایک علمی و ذہنی اور دوسرا روحانی و قلبی۔ پہلے طریقے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنِ کریم کی آیات و احکام اور دیگر اصولِ حیات و حکمت سکھائے، اور دوسرے طریقے سے اپنی نگاہِ کیمیا اثر کے فیض سے ایمان لانے والوں کے شیشہ ہائے قلوب سے قبل از اسلام گناہوں اور غیر اللہ کی محبت کی تمام تر کثافت اور زنگ اتار کر اللہ کریم کے لیے شدید محبت کا رنگ اجاگر فرما دیا۔ پہلا طریقہ زبان و بیان سے متعلق اور دوسرا طریقہ القائی و انعکاسی اثرات کا حامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی کوئی شخص ایمان لانے کی غرض سے آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اس کے قلب پر ایک نگاہِ معجز اثر پڑی اور وہ نفس کی تمام تر آلائشوں اور وساوسِ شیطانی سے پاک صاف ہو گیا۔۔۔ صحابی بن گیا۔"

یعنی واضح ہوا کہ دینِ متین کے دو پہلو ہیں۔ پہلے شعبے میں ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات ہیں جو فقہی اصطلاحات اور اوامر و نواہی پر مشتمل ہیں۔ یہ تعلیماتِ نبویؐ کی ظاہری صورت ہے، اسے شریعت کہتے ہیں کہ قرآن، حدیث اور فقہ کے ستونوں پر ایمان، عبادت، اخلاق اور معاملے کی اُستواری پر توجہ رکھی جائے۔ دوسرا شعبہ طریقت، نعمتوں، برکتوں اور تحفوں کا شعبہ ہے جس کا مقصود قرآن و حدیث کی

روشنی میں روح کو تقویت دینے اور باطن کو طہارت و پاکیزگی کے زیور سے آراستہ کرتے ہوئے اُن قلبی کیفیات کا حصول ہے جو نبیٔ کریم ﷺ نے تقسیم فرمائیں اور تاابد عنایت فرماتے رہیں گے۔ یہ کسی ولی کو خود حضور ﷺ کی بارگاہ سے پہنچتی ہیں اور کسی کو اہلِ برزخ انعام کرتے ہیں۔ شریعت و طریقت پر گامزن سالک حقیقت و معرفت کی منازل سے بھی ہمکنار ہو جاتا ہے کہ مذکورہ مقامات باہم متّصل ہیں۔ باغبانی کی اصطلاح میں بات کریں تو شریعت مثلِ زمین اور چمن آرائی کا بنیادی مقام ہے۔ طریقت اس میں سینچا ہوا تخم جو بتدریج کونپل سے پودے اور پھر پیڑ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ حقیقت اس پیڑ پر آنے والے پھول اور پھل جب کہ معرفت رنگِ گل، ذائقۂ ثمر اور خوشبوئے چمن ہے۔

ظاہر اور باطن اہلِ تصوف کے ہاں بطور اصطلاح بھی استعمال ہوتے ہیں۔ نماز کے دوران بدن اور لباس کی طہارت، رکوع و سجود اور قیام وغیرہ نماز کے ظاہری احکامات ہیں جبکہ بخاری شریف کی یہ حدیث مبارکہ ''عبادت یوں کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو'' باطنی احکامات کی نمائندگی کرتی ہے۔ گویا اتّباعِ رسول ؐ اگر ظواہر تک محدود رہے تو یہ شریعت ہے اور اگر باطن بھی نورِ رسالت ؐ سے منور ہو جائے تو اسے طریقت کہتے ہیں۔ تصوف قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک مومن کے باطن کو نورِ ایمان سے مزیّن و آراستہ کرنے کا نام ہے اور اس کی عظمت و اہمیت کا واضح اقرار علومِ ظاہری کے مسلّمہ پیشوا حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''علمِ باطن قلوب کے ایمان و معارف و احوال کا علم ہے اور وہ علم ہے باطنی ایمان کے حقائق کا اور یہ باطنی علم اسلام کے ظاہری اعمال سے افضل و اشرف ہے۔'' (الفرقان، صفحہ۔۸۲)

حاصلِ کلام یہ کہ باطنِ دین کی حفاظت اوراس کا فروغ وترویج اولیائے کرامؒ کے سپرد ہے اورانھیں کچھ ایسے فرائض سونپے گئے ہیں جن کی بجا آوری ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ برصغیر کے عظیم ترین صوفی اور علماء کے افتخار حضرت سیّد علی ہجویریؒ اپنی تصنیفِ لطیف 'کشف المحجوب' (ص ۳۵۔۳۶) میں فرماتے ہیں:

"اہلِ تصوف کی تین قسمیں ہیں۔ایک وہ جو صوفی ہیں اور اپنے معاملات میں ہر اعتبار سے ثقہ اور کامل ہیں۔ یہ صاحبان اپنی ذات میں فانی اور ذاتِ حق میں باقی ہیں۔ یہ صاحبانِ وصول ہیں۔دوسرے وہ جو متَصوّف ہیں۔ یہ اپنے مجاہدے سے مراتب حاصل کرتے ہیں اور صاحبانِ وصول کی پیروی کرتے ہیں۔ انھیں صاحبانِ اصول کہیے۔تیسرے مستَصوِف ہیں۔ یہ لوگ تصوف کے معاملات میں بالکل کورے اور بہروپیے ہیں۔ نقالی ان کا شیوہ ہے۔صوفیاء کے نزدیک ان کی حیثیت مکھی کی مانند ہے جو ہر وقت ہوس میں مبتلا رہتی ہے۔ان کا کام مال و دولت جمع کرنا اور جاہ ومنصب حاصل کرنے کی فکر کرنا ہے۔ یہ صاحبانِ فضول ہیں۔"

بدقسمتی سے آج کے دور میں مستَصوِفین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انھیں شمار کرنا امرِ محال ہے۔ داتا صاحبؒ نے نہایت باریکی سے فانی فی اللہ اور باقی باللہ کی دقیق مثال روشن کرتے ہوئے بتایا ہے کہ زندگی کی چمک دمک پر مرمٹنے اوراس کی عارضی رنگینیوں پرنظر رکھنے والے بھلا تصوف کے لازوال رنگوں سے کیونکر فیض یاب ہو سکتے ہیں ۔ یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ آخر ہر دور میں فانی فی اللہ حضرات کو ہی خلق خدا کی تربیت اور ہدایت کے لیے تصانیف منظرِ عام پر کیوں لانا پڑیں۔

آیاتِ قرآنی اور احادیثِ مبارکہ اپنے اپنے مقام پر حکم اور فیصلے کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم اپنی مرضی ، فائدے اور سہولت کے احکامات پر تو عمل پیرا ہوں اور باقی سے رخصت طلب کرلیں۔ اسلام علم، عمل اور اخلاص کا نام ہے۔ علم وعمل

کی دولت علماء وفقہاء سے نصیب ہوتی ہے جب کہ اخلاص کا خزانہ صوفیاء سے میسر آتا ہے۔ اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ البقرۃ) پہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان تینوں کی یکجائی ہی دراصل حقیقی کامیابی کی دلیل ہے۔ اولیاء کا منکر، ان کے فیوض و برکات سے بے بہرہ ہونے کے علاوہ ہدایت، ایمان اور روحِ دین سے بھی محروم رہتا ہے۔ اس کے پاس صورتِ ہدایت، صورتِ ایمان اور صورتِ اسلام تو ہوتی ہے لیکن وہ حقیقتِ ہدایت، حقیقتِ ایمان اور حقیقتِ اسلام سے عاری ہو جاتا ہے۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ یہ حقائق انہی سعادت مندوں کو نصیب ہوتے ہیں جو اہل اللہ کے نیاز مند، محب اور مخلص ہوں اور ان کی خدمت وصحبت پر یقین رکھتے ہوں۔

مذہب کا ظاہر اور باطن بے شک الگ الگ طبقوں کے سپرد ہے لیکن اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ ظاہر و باطن میں دوئی ہے یا ان کی ہم آہنگی محال ہے۔ دینِ اسلام کو اگر ایک پھول سے تشبیہ دی جائے تو رنگ اس کا ظاہر اور خوشبو اس کا باطن ہے۔ سالک کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مذہب کی باطنی ذمہ داری پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ظاہری اعمال کی عاشقانہ پرورش اور بجا آوری بھی ضروری ہے۔ شاید یہی نکتہ تھا جسے سامنے رکھ کر شیخ ریاض الدین سہروردیؒ نے فرمایا:

> "پھر مذہب کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اس کا ظاہر خلق اللہ کے ساتھ ادب کا استعمال ہے اور اس کا باطن نزولِ احوال اور مقامات کے وقت حق تعالیٰ کی معیت ہے۔ چنانچہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو نماز میں اپنے کپڑوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا..... اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا۔" (آداب المریدین، ص ۳۰۔۳۱)

مراد یہ کہ خضوع وخشوع (ظاہر و باطن) کا اتحاد لازمی شرط ہے ورنہ عبادت باطل ہوگی۔ اولیاء کے ارشادات کو سمجھنا لازمی ہے ورنہ خطرہ ہے کہ قاری آدھے

ادھورے مطلب یا من پسند معنی پا کر مفہوم کو خلط ملط کر دے گا اور عمل کے حوالے سے کوتاہی کا مرتکب ٹھہرے گا۔ ان رموز کی پہچان از حد ضروری ہے جو صاحبِ تحریر نے عبارت میں واضح یا پوشیدہ طور پر رکھ دیئے ہیں۔

بارگاہِ الٰہی میں حضوری کے لیے عقیدۂ توحید کا صحیح ہونا ایک ایسی شرط ہے جو محض کلمہ پڑھنے سے پوری نہیں ہوتی۔ حضوری کا حصول صرف ایک صورت میں ممکن ہے اور وہ ہے سورۃ اخلاص میں بیان کی گئی صفات پر مکمل ایمان۔ سالک اگر اس سورۃ مبارکہ کا مجسم و مکمل گواہ نہیں تو گویا کچھ نہیں۔ افتخارِ اولیاء حضرت جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے:

"کمالِ احدیت کے ساتھ اس کی وحدانیت کو جان کر اللہ کو فردِ یکتا جاننا، وہ ایسا ایک ہے جس نے نہ کسی کو جنا نہ خود کسی سے پیدا ہوا۔ اس کا نہ کوئی مقابل ہے نہ کوئی مثل اور نہ ہم شبیہ...... اس جیسا کوئی نہیں وہ سمیع البصیر ہے۔" (رسالہ قشیریہ، ص ۷)

قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونا تصوف کا بہترین عملی اظہار ہے۔ مرشد کا فرض ہے کہ مرید کی رہنمائی کرتے ہوئے اس راہِ راست کی طرف شوق دلائے جو "قل ھو اللہ احد" کی منزل کا پیش خیمہ ٹھہرے۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں انسانی فکر و عمل کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے اور وہ رضائے باری تعالیٰ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یقین کی اس منزل میں عارضی سہاروں کے نقوش دھندلا جاتے ہیں اور حقیقی محافظ کا نقشِ جلی نورِ ایمان بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ جب سالک مکمل طور پر Surrender کر دیتا ہے تو ذاتِ الٰہی اس کی نگہبان بن جاتی ہے اور اُسے باقی تمام سہارے جھوٹے، ناپائیدار اور کھوکھلے دکھائی دیتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا ج وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○

"اور اللہ تعالیٰ نہ ان کی حفاظت سے تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے، وہ تو بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔" (البقرۃ۔ ۲۵۵)

اس کے ساتھ عجز بھی لازمۂ تصوف ہے ورنہ سب کچھ غارت ہو جائے گا۔ فہم ہو کہ عقل، گمان ہو کہ تخیلِ محض، قیاس ہو کہ ہمارے حواس، سب کچھ عاجز ہے کہ اللہ اکبر کی صفات کا احاطہ کر سکے۔ وہ ذاتِ بے کنار لَیسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے، صورت و ہیئت اور شکل سے مبرّا۔ اس لیے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے جسے شاہ عبد العزیزؒ، شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ اور امام غزالیؒ جیسے علمائے کبار نے نقل کیا ہے: 'العجز عن درک الادراک ادراک' یعنی عجز ہی درِ ادراک کھولے گا مگر اس طرح کہ علم و ایمان اسے جِلا دے اور عشقِ حقیقی اسے رخشندگی و ضوریزی عطا کرے۔ پھر معلوم ہوگا کہ مقامِ ذات میں احدیت سے مراد صرف اور صرف ذاتِ حق ہے اور اس کی حقیقت اور منبع علم میں نہیں سما سکتا۔ یہ نکتہ نبیٔ کریمؐ کی حدیثِ مبارکہ سے بھی ثابت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ

فکر کی انتہا معرفت ہے مگر یاد رہے کہ الحاد کا شکار اور بے لگام فکر عرفانِ حق کی بجائے راہِ انکار اور گمراہی کی جانب لے جاتی ہے۔ دوسری طرف حلال فکر واجب ہے جس کا ذکر اکابر صوفیاء نے کتبِ عالیہ میں کیا ہے۔ فکر حلال یہ ہے کہ سالک عظمتِ الٰہی کے باب میں غور کرے اور تدبّر سے کام لے۔ یہ وہ مقام ہے جو طالبِ خدا کو دنیاوی جھمیلوں سے نکال کر احدیّت کے رستے پر لے چلتا ہے، اس کے اندر قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے کی توفیق نمو پاتی ہے اور وہ انوارات کی توجیہہ عاشقانہ انداز میں کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ بے شک عشق وہ نکات تعلیم کرتا ہے جن تک مکتبی ذہنوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے فیصلوں میں کائنات کی تمام مخلوقات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے لیکن ایک عام آدمی کے پیشِ نظر محض اُس کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے اور اس کی خواہشات اس کی کمزور ذہنی کیفیت کی عکاس ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس امتحان گاہ کے تمام

نتائج ہماری آرزو اور مرضی کے موافق ہوں۔ یہ خالقِ دو جہاں کی حکمت ومنشا پر منحصر ہے کہ سنگلاخ چٹانوں سے ٹھنڈے میٹھے چشمے جاری کرے یا بے کراں تپتے صحراؤں میں ہرے بھرے نخلستان پیدا کردے۔ لٰہذا اپنی پسند کو اپنے رب کی پسند کے مطابق ڈھالنے اور اپنی مرضی کو اس کی رضا میں گم کرنے سے ہی انسان حقیقی مسرّت و شادمانی اور کامیابی و کامرانی سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا اضطراب ایک سکون آور کیفیت میں ڈھل جاتا ہے۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

"ہمارا کارساز (اللہ) ہمارے کام کی فکر میں ہے، جب کہ کام میں ہماری فکر ہمارے آزار کا باعث ہے۔"

احدیت پر ایمان کے بعد مومن حقیقتِ محمدیؐ تک آتا ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کا اسمِ ثانی ہے کیونکہ آپؐ سید الانبیاء بھی ہیں اور خاتم الانبیاء بھی۔ قرآنِ کریم میں دین کے اکمل ہونے کی خوشخبری اسی پر دلیل ہے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابی امامہؓ سے مروی وہ احادیث اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتی ہیں کہ عقل، روح اور نور سے دراصل عقلِ اول اور حقیقتِ محمدیؐ ہی مراد ہے کیونکہ باقی تمام موجودات اسی کے مظاہر ہیں۔ اس نکتے کی تفسیر میں عیاں ہوگا کہ تمام درجات و مراتب کی حیثیت عقلِ اوّل یا حقیقتِ محمدیؐ کے مقابل ثانوی ہے۔ اصل میں مقامِ احدیت اور حقیقتِ محمدیؐ ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔ ان کی لَوئیں جدا نہیں بلکہ ایک ہی دیپ میں سنہری اور احمریں جھلک مسلسل ہوجاتی ہے۔

تصوف سب سے پہلے ذاتِ الٰہی کے عرفان کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی مہرِ اسمِ مبارک دل پر ثبت ہو جائے اور یہ تعلیم دین و ایمان کا حصہ بن جائے کہ شفاعت و سفارش بھی منشائے ربانی کے بغیر ممکن نہیں اور یہ تبھی ہوسکتا ہے جب غیر اللہ کا تصور سراسر محو ہو

جائے۔ بے شک مرشد چاہے جس مقام اور مرتبے پر فائز کیوں نہ ہو، حکمِ الٰہی کے بغیر سفارش نہیں کر سکتا کہ اختیار اسی ذات کو حاصل ہے جو مختارِ کل بھی ہے اور مالک الملک بھی۔ اس لیے ایسے متوسّلین جو عمل کے بغیر اس خیال سے اپنے شیوخ کی چوکھٹ پر پڑے رہتے ہیں کہ ان کے مرشد انھیں ہر حال میں داخلِ بہشت فرما دیں گے، اپنے عقیدے کی اصلاح کریں۔

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

میرے شیخِ مکرم حضرت باغ حسین کمالؒ نے ایک بار مجھ سے فرمایا:

"یاد رکھو صرف بیعت کر لینے سے تمہارے ساتھی اس قابل نہیں ہو جائیں گے کہ سلوک و معرفت ان پر سہل ہو جائے۔ انھیں خوفِ الٰہی اور حبِ رسولؐ کا سبق ہر حال میں یاد رکھنا ہے۔"

فقیر اپنے قول کی مکرر ادائیگی ضروری خیال کرتا ہے کہ سالک اپنے مرشد کی وساطت سے دربارِ نبویؐ میں باریاب ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی آخر الزماںؐ، ذاتِ باری کے بعد تمام مخلوقات کا سب سے بڑا آسرا ہیں جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشادِ مبارکہ ہے:

"قیامت کے دن میں وہ پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر شق ہوگی اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جس کو شفاعت کی اجازت ہوگی اور جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔" (سنن ابی داؤد)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپؐ بھی معبودِ حقیقی کے حکم پر سرِ اقدس خم کرنے والے ہیں۔ جب اللہ کے محبوبؐ مرضیٔ حق کے بغیر کوئی قول و فعل سرانجام نہیں دیتے تو عام انسانوں کی کیا مجال۔ لہٰذا سالک کو چاہیے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت دل و جاں میں سجا لے:

قُلۡ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ (الکہف۔۱۱۰)

”کہہ دیجیے کہ درحقیقت میں بھی ایک بشر ہوں تمہارے جیسا،

(فرق یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔“

مذکورہ آیت کے مطابق نبیٔ کریمؐ نے اپنے قول وفعل میں بہرحال حکمِ الٰہی کی متابعت فرمائی اور اپنے آخری امتی تک ہر ایک کو یہ درس دیا کہ جو انسان خود کو امرِ ربانی کے مطابق ڈھال لیتا ہے، اسی پر خوشنودیٔ الٰہی کے در وا ہوتے ہیں۔ اسوۂ محمدیؐ کے پیروکار ہمیشہ شریعت کے پابند رہتے ہیں اور کبھی اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ سالک تبھی ایمانِ کامل کا حامل ہوگا جب وہ حضورؐ کو شافع محشر سمجھے لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھے کہ آپؐ کی شفاعت بھی اللہ کے حکم سے نصیب ہوگی۔ قرآنِ کریم میں بار بار شرک سے بچنے کی تلقین میں یہی راز مضمر ہے کہ مشرک کے سوا ہر کلمہ گو امیدوارِ لطف وکرم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ

”یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا

جسے چاہے بخش دیتا ہے۔“ (النسا۔۴۸)

ترمذی شریف کی یہ حدیث مبارکہ اسی نکتے کا تسلسل ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

”میرے پاس اللہ کا پیغام آیا اور مجھے اللہ نے اختیار دیا کہ اللہ میری آدھی اُمت کو جنت میں داخل کردے یا میں شفاعت کروں۔ میں نے شفاعت کو اختیار کیا اور یہ شفاعت ہر اس مسلمان کو حاصل ہوگی جو شرک پر نہیں مرے گا۔“

ایمانِ کامل شفاعت وبخشش کی بنیاد اور لازمی شرط ہے لہٰذا ہر صاحبِ ایمان پر لازم ہے کہ حفاظتِ ایمان کے لیے شرکِ کبیر کے ساتھ ساتھ شرکِ صغیر، شرکِ جلی اور شرکِ خفی کے ارتکاب سے بھی اجتناب کرے اور اس نویدِ رحمت سے شادکام ہو:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً ج

"جو بھی عملِ صالح کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت مگر شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اسے حیاتِ طیبہ عطا فرمائیں گے۔" (النحل۔۹۷)

فقیر اس نکتے کو یوں تمام کرتا ہے کہ بے شک حضورؐ کی شفاعت اسی شخص کو نصیب ہو گی جس نے آپؐ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاری اور اللہ کو واقعی رب العالمین جانا۔

احکاماتِ خداوندی اور تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق زندگی بسر کرنا صوفیاء کا طرۂ امتیاز ہے۔ صحابہ کرامؓ سے تابعینؒ اور پھر تبع تابعینؒ سے اولیائے کرامؒ تک ہر سینہ عشق کی جوت سے فروزاں دکھائی دیتا ہے۔ ان مبارک ہستیوں کے وجودِ مسعود ہی سے عشق کا معیار، سلوک کا وقار اور تصوف کا اعتبار قائم ہے۔ اس بارے میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے 'عوارف المعارف' میں صراحت کے ساتھ ثابت کیا ہے:

"صوفیائے کرامؒ مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو اتباعِ رسولؐ میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے آپؐ کے اقوال کی مکمل پیروی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس بات کا حکم دیا انھوں نے اس کی تعمیل کی اور جس بات سے روکا اس سے باز رہے۔" (ص۔۸۲)

الغرض کتبِ تصوف کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ہر دور میں صوفیاءؒ نے حکمِ الٰہی اور فرمانِ رسولؐ کی بجا آوری کو اپنا دستور و منشور قرار دیا۔ بقول حضرت سلیمان تونسویؒ:

"اتباع دو باتوں سے عبارت ہے۔ جس بات کا اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے اس کی بجا آوری کی جائے اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے انھیں نہ کیا جائے۔" (تاریخِ مشائخ چشت، ص ۲۴۳)

راقم کے خیال میں تصوف طاعتِ الٰہی اور پیروی رسولِ کریم ﷺ کے سوا کچھ نہیں۔ درحقیقت اطاعتِ الٰہی اور پیروی رسولِ کریمؐ کی حقیقی سمجھ دائرۂ تصوف میں شامل ہوئے بغیر نصیب بھی نہیں ہوسکتی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی ارفع مسافت میں کسے رہنما کیا جائے، کس کا دامن تھاما جائے۔ اس حوالے سے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مشورت بہرحال پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ فرماتے ہیں:

"پیر ایسا ہو جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کو اچھی طرح جانتا ہو اور جب صورتحال یہ ہوگی تو پیر کسی ایسی بات کا حکم نہ دے گا جو خلافِ شریعت ہو۔" (فوائد الفواد، ص ۲۵۰)

مندرجہ بالا قول کڑے معیار تجویز کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ قرآنِ کریم کی سمجھ، ارکانِ دین کی بجا آوری، رسولِ کریمؐ کا عشق، سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی کے ذریعے ربِ اکبر تک رسائی کی جدوجہد اور مجازی نسبتوں کو ترک کر کے حقیقتِ اولیٰ پر ایمان، دوم نہی عن المنکر یعنی برائی سے بچنا اور بچانا، سچائی کو اس حد تک راسخ کر لینا کہ وہ ایمان کا جزو بن جائے اور غیر اللہ کا شائبہ تک نہ رہے۔ مرشد سے مراد وہ مردِ کامل ہے جو اپنے شیخ کے زیرِ نگرانی تزکیۂ نفس کے مراحل سے گزرنے کے بعد بحکمِ شیخ اپنی صحبت اور توجہ سے دوسروں کے نفس کا تزکیہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس حوالے سے اہلِ سلوک نے مرشدِ کامل کے لیے ایک باقاعدہ معیار مقرر کر کے گروہِ کاملین کو تین درجوں کامل، اکمل اور مکمل میں تقسیم کیا ہے (لیکن عام طور پر اکمل اور مکمل کے لیے بھی لفظ کامل ہی مستعمل ہے)۔ کامل وہ شخص ہے جو خود تو باطنی کمالات کا حامل ہو لیکن کسی طالب کو فیض یاب نہ کر سکے۔ اکمل اسے کہا جاتا ہے جو خود بھی صاحبِ اسرار ہو اور فیضانِ باطنی و ہدایتِ ظاہری سے دوسروں کو بھی فیض یاب کرے۔ ایسا شخص اول الذکر سے

بہتر ہے لیکن اسے مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مکمل اس صاحبِ کمال کو کہا جاتا ہے جو اپنے روحانی تصرف اور باطنی توجہ سے کسی طالب کو، چاہے وہ کسی قابل ہو یا نہ ہو، دربارِ اقدسؐ میں پہنچا سکے۔ اس ضمن میں حضرت باغ حسین کمالؒ 'حالِ سفر' میں فرماتے ہیں:

"اولیائے کرامؒ میں اس شخص کو بھی کامل قرار نہیں دیا جا سکتا جو خود تو وہاں (دربارِ اقدسؐ) باریاب ہو مگر دوسروں کو وہاں لے جانے کی قوت و اجازت سے بہرہ ور نہ ہو۔"

حضرت سلطان باہوؒ نے بھی 'عین الفقر' میں یہ بات واشگاف انداز میں بیان کی ہے:

"مرشدِ کامل طالب اللہ کا ہاتھ پکڑ کر منزلِ مقصود (دربارِ اقدس ﷺ) تک پہنچا سکتا ہے۔ جس شخص کو یہ قدرت نہ ہو اسے کامل کہنا غلط ہے بلکہ وہ راہزن ہے۔"

گویا تصوف انسانی معاشرے میں رہتے ہوئے شریعت کی پاسداری اور تحفظ کا نام ہے اور شیخ کامل وہ چراغِ طریقت ہے جو شریعت کا سہانا اور حقیقی روپ دکھاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی تارکِ شریعت، تارکِ صوم و صلوٰۃ یا نبی کریمؐ کی روحانی سرپرستی سے بے بہرہ دین کا محافظ بن بیٹھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کے مطابق:

جس طرح آپ بخاری (شریف) کی کسی روایت کو محض اس لیے کلامِ رسولؐ تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ معتبر سندِ تسلسل کے ساتھ رسولؐ سے روایت ہوئی ہے، ٹھیک اسی طرح مرشد کا قلب بھی ایسے ہی مضبوط واسطوں کے ساتھ رسول اللہؐ کے قلبِ مبارک سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ (تاریخ تصوف۔ ص ۲۳۰)

شریعت اور طریقت کے تال میل سے تصوف وجود میں آتا ہے اور اس کا صحیح رستہ وہی ہے جس کی تعلیم قرآن و سنت نے دی ہو اور سند بھی انہی ماٰخذات سے حاصل کی جائے۔ دوسری صورت میں زندیق اور ملحد تو ہو سکتے ہیں، مومن و صوفی نہیں۔

تاریخ تصوف ایسے ان گنت واقعات سے آراستہ ہے جب ربِ کائنات نے اپنے بندوں پر خاص کرم فرماتے ہوئے ان کے درجات میں اضافہ کیا اور ان پر اپنی

رحمتوں کے در کھولے کیونکہ باری تعالیٰ نے رحمت کو خود پر لازم کرلیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام۔۵۴)

"تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کرلیا۔"

'دلیل العارفین' میں حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کا یہ قول ملتا ہے:

"عارفوں پر ایک حال ہوتا ہے۔ اس وقت وہ آگے بڑھتے ہیں اور ایک قدم حجابِ عظمت سے گزر کر حجابِ کبریائی تک جا پہنچتے ہیں اور دوسرے قدم میں واپس آجاتے ہیں۔" (دلیل العارفین، ص۔۱۴)

یاد رہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ملفوظات کو ان کے شاگرد اور مرید حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے محفوظ کر کے "دلیل العارفین" کا نام دیا تھا۔ سالکین کے واسطے یہ کتاب نعمت سے کم نہیں۔ ذوق وشوق اور مسافت کی لگن سالک کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور سرفرازی کا باعث بنتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"مجھے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام سمجھایا کہ تمہارے اوپر دو جامع اسموں کا نور منعکس ہوا ہے یعنی اسمِ مصطفوی ﷺ اور اسمِ عیسویؑ۔ تو عنقریب کمال کے افق کا سردار بن جائے گا اور قربِ الٰہی کے تمام اقالیم پر چھا جائے گا۔" (التفہیمات الالٰھیہ، جلد۲ ص ۱۴۵)

ظاہری طور پر غیر تربیت یافتہ حضرات اس قسم کے دعووں پر استہزاء کرسکتے ہیں کیونکہ اُنہیں اس عالم اور کیفیت کا قطعی شعور نہیں ہوتا۔ منازلِ سلوک میں یہ بہت معمولی باتیں ہیں اور یقیناً تصوف کا مقصود بھی نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کرامتوں اور علم کے ذریعے اپنے بندوں کی دم سازی اور دلجوئی فرماتا ہے تاکہ مومنوں کی شکرگزاری کا بدلہ دے اور بے شک وہ وعدہ وفا کرنے والا ہے۔ پھر یہ امر بھی صاحبانِ نظر سے پوشیدہ

نہیں کہ یہاں اور وہاں کا نظام اور اوقات مختلف ہیں۔ اسی لیے جن کاموں کو لوگ مافوق الفطرت سمجھتے ہیں وہ اولیاء کی جبلّت بن جاتے ہیں۔ راقم اور اس جیسے تصوف کے راہی جب ان واقعات پر غور کرتے ہیں تو سوائے سبحان اللہ کے اُن کی زبان سے اور کچھ نہیں نکلتا۔ سچ ہے کہ طبائع کی ہم آہنگی ہی ارواح کو اِک دوجے سے جوڑتی اور اُنہیں باہم متوجہ کرتی ہے۔

برزخ میں ملاقات کے دوران حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو جس مقام پر دیکھا وہ ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔ میں نے بعد از سلام اُنہیں ''یا قائم الزّماں'' کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان ایک بار پھر عارضی مشکل میں پھنس گیا ہے لیکن یہ امرِ ربانی ہے، آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ خوشحالی اور ترویجِ اسلام کا دور قریب ہے۔''

مزید فرمایا: ''حضرت باغ حسین کمالؒ کے بعد آپ نے سلسلۂ عالیہ اویسیہ کمالیہ کو اپنی ریاضت کے ذریعے خوب شباب دیا ہے۔''

میں نے عرض کیا...... ''یہ صرف میرے اللہ کا کرم، حضور نبیٔ کریم ﷺ کی شفقت اور میرے حضرت جیؒ کی توجہ کا ثمر ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔'' مسافر 'فیوض الحرمین' میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی یہ عبارت دیکھ کر صاد کر چکا تھا:

''مکہ میں تھا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو قائم الزماں دیکھا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب اللہ نے اچھے نظام کو استوار کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے مجھے قیام کا ذریعہ بنایا۔''

اس میں کیا شک ہے کہ شاہ صاحبؒ کے درجات بہت بلند ہیں اور برصغیر کے علماء وصوفیاء پر آپؒ کی تعلیمات کا بہت مثبت اثر ہوا۔ آپؒ ہی نے حضرت امام ربانی

مجدد الف ثانیؒ کے بعد دین و تصوف کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور ابن الوقتوں کی فتنہ انگیزیوں سے لوگوں کو آگاہ کیا اور کیوں نہ ہو، محدث دہلویؒ کا گھرانہ بنا ہی خدمتِ دین کے لیے تھا۔ میرے شیخِ مکرم حضرت جی باغ حسین کمالؒ شاہ صاحبؒ کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ فرماتے اور مجھے اکثر اُن کی تصانیف کے باریک نکات سے آگاہ کیا کرتے تھے۔

ولی تو حکمِ الٰہی کے بغیر بات ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

**وما قلت حتی قیل لی قل ولا تخف**

**وانت ولی فی مقام الولایۃ**

"میں نے کوئی بات نہیں کی مگر اُس وقت جب ارشاد ہوا کہ کہہ اور مت ڈر کیونکہ تو مقامِ ولایت میں میرا چنا ہوا ولی ہے۔"

صوفی ظن و گمان میں مبتلا لوگوں کو یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے اور اگر پھر بھی کوئی محروم رہ جائے تو اُس کی اپنی قسمت۔ ایک عامی اہلِ صفا کی حقیقی حالت و کیفیت کا اِدراک نہیں کرسکتا۔ حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ حضرت مولانا رومؒ کی شان میں یوں رطب اللسان تھے:

**لو کان للالوھیۃ صورۃ لکان ھذا**

"اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صورت معین ہوتی تو وہ حضرت (مولانا رومؒ) کی صورت میں ظاہر ہوتا۔" (ملفوظاتِ مہریہ، ص ۴۶)

سلوک و ذوق سے نابلد اور معاملاتِ عشق سے ناواقف شخص یہ فقرہ سن کر کانوں کو ہاتھ لگائے گا لیکن یہ مولائے رومؒ کا درجہ بتانے والا جملہ ہے۔ حضرت صدر الدین قونویؒ کوئی عام صوفی نہیں تھے اور حضرت مہر علی شاہ گولڑویؒ جیسے محتاط عالم اور ولی یونہی

اُن کا قول نقل نہیں کرتے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ مولانا رومؒ کا عشق اس مقام پر تھا جہاں رنگ وخوشبو ایک ہو جاتے ہیں اور اکائی پوری تابنا کی کے ساتھ جگمگا اٹھتی ہے۔ ایک عامی تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا یہ قول:

قدمی ھذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ

"تمام اولیاء کی گردنوں پر میرا قدم ہے۔"

پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائے کہ حضرتؒ نے یہ کیا فرما دیا لیکن فقیر پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ اولیاء اللہ کی باتوں میں رمزیں ہوتی ہیں جنہیں کوئی ولی ہی سمجھ سکتا ہے۔ شیخِ محترم، حضرت باغ حسین کمالؒ نے 'حالِ سفر' میں اس کی عقدہ کشائی یوں فرمائی ہے:

"آپؒ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیع سیکرٹریٹ اور اولیائے زمانہ کے درمیان ایک ضروری کڑی ہیں۔"

ایک اور مقام پر غوثِ اعظمؒ نے یہاں تک فرما دیا ہے:

خضنا فی بحر لم یقف علی ساحلۃ الانبیاء

"ہم نے اس دریا میں غوطہ لگایا جس کے کنارے پر انبیاءؑ کو کھڑا ہونا نصیب نہ ہوا۔"

مذکورہ نکتے کو حضرت مہر علی شاہؒ نے نہایت دل آویزی سے بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس قول میں دریا سے مراد حقیقتِ محمدیہؐ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اُمتِ محمدیہؐ کے اولیاء ہی اس حقیقت کے ادا شناس ہو سکتے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیرانِ پیرؒ کے ارشاد پر اپنی گردن مبارک جھکا کر بادۂ تسلیم کا مزہ یونہی تو نہیں چکھا تھا۔

اولیاء کے ظاہری افعال و اعمال تو عام آدمی کے سامنے ہوتے ہیں جن کی خالی خولی گواہی دی جا سکتی ہے اور بس لیکن روحانی سفر اور اس میں پیش آنے والے واقعات و حالات کی تصدیق عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ حضرت علیؓ سے

مروی ایک حدیثِ قدسی کے مطابق باطنی علم اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس کو وہ اپنے بندوں کے دل میں رکھتا ہے اور جس سے اس کے سوا کوئی آگاہ نہیں۔ اس لیے ایک عامی کو اس باب میں زحمتِ لب کشائی نہیں کرنی چاہیے۔ ان معاملات کو خرد کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا کہ عقل بہرحال محدود اور معین دائرے کی مسافر ہے جبکہ عشق لامتناہی مسافت کا نام ہے۔ ربِ کریم نے انسان کو سمجھ بوجھ کے لیے تین قوتیں وہم، عقل اور بصیرت عطا کی ہیں۔ عقل کے مقابل وہم کمتر درجے پر ہے اور نورِ بصیرت کے سامنے عقل کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ قبلہ نما تو ہو سکتی ہے لیکن قبلہ نہیں۔ سو محض عقل و خرد پر بھروسہ کرنے والے کو

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

جیسی حقیقت سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ بدقسمتی سے ہم کرامت فروش دور میں جی رہے ہیں جہاں تارکینِ شریعت تصوف کے نام پر بلند بانگ دعووں سے دیواروں کی دیواریں سیاہ کیے بیٹھے ہیں۔ اگر اہل اللہ موجود نہ ہوں تو آس کے سُورج ڈوب جائیں اور ہر سو تاریکیوں کے بھوت رقص کرنے لگیں، لیکن یہ صرف آج کا مسئلہ نہیں، ہر دور اس طرح کے مسائل سے آلودہ رہا ہے۔ یقیناً حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس طرح کی صورتِ حال ملاحظہ کی ہوگی کہ انھیں یہ کہنا پڑا:

"ایسے جاہل صوفی اور تصوف کے مدعی (جنہیں قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں) دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔" (التفہیمات الالٰھیہ، جلد دوم)

شاہ ولی اللہؒ کا دور بہت حد تک ہمارے عہد سے مماثل تھا۔ وہ زمانہ مرہٹہ گردی، مسلمانوں کی باہمی منافرت، حکمرانوں کی عیش پرستی اور اُمتِ مسلمہ کے زوال اور اس

پر اصرار کی بدترین مثال ہے۔ ہمارا عہد یہود، ہنود اور نصاریٰ کی سازشوں، امریکہ گردی، اہلِ اقتدار کی جاہ پرستی، ملی غیرت سے خالی ضمیر اور اسلامی رُوح سے تہی دلوں کا عہد ہے۔ ایسے میں فقہا، صوفیاء اور علماء کا فرض ہے کہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں اور اللہ کی یاد اور نبیٔ کریم ؐ کی محبت سے دلوں کی دنیا آباد کرنے کی کوشش کریں تاکہ روزِ محشر شافعِ امم ؐ کے حضور شرمندگی نہ ہو۔ ایک عالمی طاقت (امریکہ) دندناتی پھر رہی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ دستِ اجل اس کے تعاقب میں ہے اور ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب اسے خاک چاٹنا پڑے گی اور اُس کے لیے اپنا شیرازہ قائم رکھنا بھی محال ہو جائے گا۔ فقیر نے آج سے بہت پہلے ۱۸؍جولائی ۲۰۰۱ء میں امریکی شکست و ریخت پر بات کرتے ہوئے ایک محفل کے سامعین کو گواہ بنا کر اعلانیہ کہا تھا:

''......شیر کا شکار کرنے کے لیے اس کی کچھار میں نہیں گھسا جاتا بلکہ اسے نکال کر وہاں لایا جاتا ہے جہاں مچانیں لگی ہوں۔ گواہ رہیے گا کہ شیر کچھار سے نکل آیا ہے، ہانکا لگایا جا رہا ہے اور وہ اسی طرف آ رہا ہے جہاں مچانیں لگی ہیں۔ الحمدللہ، روحانیوں نے ''سپر پاور'' کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے انتظامات کو حتمی شکل دے دی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کو مبارک باد کہ امریکہ کے انہدام کا وقت آ گیا ہے۔''

شرط صرف اتنی سی ہے کہ اپنے اپنے دائروں میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کی جائیں۔ آج محض فکرمند ہونے سے زیادہ اپنے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اہلِ نظر اس بات پر متفکر ہیں کہ قرآن و حدیث کی موجودگی میں جہالت اور دروغ فروغ پا رہا ہے۔ یہ تصوف سے دوری ہی کا نتیجہ ہے کہ نفرتیں پھل پھول رہی ہیں، کدورتیں گھر اجاڑ رہی ہیں، عداوتوں کا بازار گرم ہے، بے یقینی جوبن پہ ہے اور ہر سُو آدم بو کی صدائیں کان پڑتی ہیں۔ اس روزافزوں منافرت سے

نجات کا واحد ذریعہ کل بھی عشقِ الٰہی تھا اور آج بھی صرف اور صرف فروغِ اسم ذات ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا ''تصوف اور تصوراتِ صوفیہ'' میں فیصلہ کن انداز ملاحظہ ہو:

''۔۔۔لیکن یہ بھی ہے کہ آنے والے وقت میں اور آنے والی صدیوں میں اگر کوئی مذہب یا مسلک زندہ رہ سکتا ہے، انسانیت کے لیے مفید ہوسکتا ہے اور سارے انسانوں کو قابلِ قبول ہوسکتا ہے تو وہ بھی تصوفِ خالص یا تصوفِ اسلامی ہی ہے، جس میں وحدتِ حق اور وحدتِ انسانی پر کامل ایمان کے ساتھ دین و دنیا کا توازن ہے۔''

علماء، فقہا اور صوفیاء میں ہم آہنگی اور فروغِ دین وتصوف حالات کا تقاضا اور وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ مشائخ کا فرض ہے کہ وہ فکرِ سود و زیاں سے بیگانہ ہو کر صاحبانِ اقتدار اور عوام کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اس ضمن میں اپنا کردار ادا کریں۔ پھر ان شاء اللہ کبھی کوئی اپنے بھائی کا گلا نہیں کاٹے گا، اُسے کمتر نہیں سمجھے گا اور مسجد کے صدر دروازے پر لگی ہوئی تختی کسی کا راستہ نہیں روکے گی۔ تصوف کا عرفان اسی کو ہوسکتا ہے جو قرآن وسنت سے آگاہ ہو اور فلاحِ انسانیت کا جذبہ رکھتا ہو۔

ترویجِ دینِ حق اور فروغِ اسمِ ذات میں صوفیاء کا حصہ کسی بھی طبقے سے زیادہ ہے۔ تاریخِ تصوف اُن معظم ہستیوں کی قصیدہ خواں ہے جنھوں نے نہ صرف دینِ فطرت کی سربلندی کے لیے عمریں صرف کر دیں بلکہ طریقت کے مختلف سلاسل قائم کر کے انسانیت کی رہبری کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ ان میں سے ہر ایک ہستی کی عظمت و رفعت اور شان جدا ہے۔ لہٰذا یہاں پر معروف سلاسل کے مختصر بیان سے قاری کو معلوم ہوگا کہ تمام سلاسل ایک شاداب گلدستے میں سجے خوش رنگ پھولوں کی صورت کس طرح باہم پیوست ہیں۔

رسولِ کریم ﷺ شیخ السّالکین ہیں اور خود اللہ تبارک تعالیٰ آپؐ کے شیخ۔ اس کے بعد تمام صحابہؓ حضورؐ کے سالک اور آپؐ اُن کے شیخ۔ یہ سلسلہ اسی طرح جدید دور تک آتا ہے۔ تمام سلاسلِ تصوف اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت علیؓ فیضانِ ولایت کا سرچشمہ اور نبیٔ کریم ﷺ کے بعد تمام صوفیاءؒ کے شیخ ہیں۔

تاریخی اعتبار سے سب سے پہلا سلسلہ چشتیہ ہے جس کے بانی حضرت خواجہ ابواسحٰق شامیؒ ہیں۔ آپؒ اپنے شیخ ممشاد علوی دِنوریؒ کے حکم پر چشت آکر قیام پذیر ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ کی وفات ۳۲۹ ہجری میں ہوئی۔ حضرت قطب الدین مودودؒ اور حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ (ہارونیؒ) اس سلسلے کے ممتاز اولیاء گزرے ہیں جبکہ برصغیر میں حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ذریعے اس سلسلۂ عالیہ کو عروج حاصل ہوا۔ آپؒ حضرت عثمان ہرونیؒ کے خلیفہ تھے اور اُنہی کے فرمان پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔

سرتاجِ اولیاء، پیرانِ پیر، مرکزِ رشد و ہدایت، حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ (پیدائش ۴۷۰ ہجری) سلسلہ قادریہ کے بنیاد گزار ہیں۔ آپؒ نے حضرت سعید ابوالخیرؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت پایا۔ مکتوبات' قصیدۂ غوثیہ اور فتوح الغیب آپؒ کی مشہور تصانیف ہیں۔ غوثِ اعظمؒ نہ صرف بہت سارے اساتذہ سے علومِ قرآن و حدیث اور فقہ میں فیض یاب ہوئے بلکہ راہِ سلوک میں بھی اُن مراتب پر پہنچے جو آپؒ ہی کا افتخار ہیں۔ بغداد کا ہر دور میں علم و فضل کا گہوارہ رہنا آپؒ کی کرامات میں سے ہے۔ حضرت باغ حسین کمالؒ کے مطابق راقم کے جدِامجد حضرت عون قطب شاہؒ بھی آپؒ کے خلفاء میں سے تھے جنہیں آپؒ کے ہم زلف ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ موصوفؒ اپنے مرشد کے حکم پر شمالی ہندوستان تشریف لائے اور یہاں سلسلۂ قادریہ کے تعارف کا باعث بنے۔ آپؒ کی اولاد سے ہی قبیلہ اعوان قطب شاہی وجود میں آیا۔

سلسلۂ سہروردیہ کے بانی صاحبِ 'آداب المریدین' حضرت ضیاء الدین سہروردیؒ ہیں لیکن اس کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے نمایاں ترین نام آپؒ کے بھتیجے اور مرید شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی فیض یاب ہوئے۔ کتب میں آپؒ کا سنِ پیدائش ۵۳۶ ہجری ملتا ہے۔ آپؒ کی بلند پایہ تصنیف 'عوارف المعارف' آج بھی سالکین کے لیے خزینۂ رشد و ہدایت ہے۔ آپؒ کے مرید سعدی شیرازیؒ نے اپنی نظم و نثر میں اکثر اپنے شیخ کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ بھی آپؒ کے خلفاء میں سے تھے۔

ایک اور بلند پایہ سلسلہ نقشبندیہ ہے جو خواجہ محمد احمد اتا یسویؒ سے شروع ہوا لیکن اس کو باقاعدہ شہرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کے دور میں نصیب ہوئی جس کے بعد یہ سلسلہ نقشبند کے نام سے معروف ہوا۔ آپؒ ظاہری طور پر حضرت خواجہ شمس الدین امیر کلالؒ کے خلیفہ تھے لیکن خاص بات یہ ہے کہ آپؒ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ سے اویسی طریقے پر مستفیض ہوئے۔ آپؒ کے خلفاء میں خواجہ محمد پارساؒ کے علاوہ خواجہ علاؤ الدین عطارؒ اور مولانا یعقوب چرخیؒ بہت مشہور اولیاء ہیں جبکہ برصغیر میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اس سلسلۂ عالیہ کی آبرو ہیں۔

راقم کو سلسلہ اویسیہ کمالیہ سے نسبت کی سعادت حاصل ہے۔ سلسلہ اویسیہ کی تاریخ نبیٔ کریم ﷺ کے زمانۂ مبارک ہی سے آغاز ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں برکات و انعامات کسی سالک کو براہِ راست حضورؐ کی بارگاہِ عالیہ سے پہنچتے ہیں تو کسی کو اہلِ برزخ کے ذریعے عنایت کیے جاتے ہیں۔ ترسیلِ فیض کا یہ انداز کہ جس میں ظاہری ملاقات کے بغیر بھی روح کو فیض یاب کیا جائے، اویسی کہلاتا ہے۔ جیسے حضرت اویس قرنیؒ حضور ﷺ کا زمانۂ مبارک میسر آنے کے باوجود ظاہری طور پر

شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکے لیکن اویسی طریق پر فیض یاب ہو کر فنا فی الرسولؐ کے مرتبۂ عالیہ پر فائز ہوئے۔ تمام بانیانِ سلاسل اور دوسرے اکابر اولیائے کرامؒ کی روحانی تربیت اویسی طریقے پر بھی ہوئی کہ انھیں اہلِ برزخ سے بھی رہنمائی حاصل رہی۔ یوں اگر دیکھا جائے تو درجۂ اولیت پر سلسلہ اویسیہ ہی فائز ہے۔ اس کا طلوع وغروب وقتاً فوقتاً جاری رہا تا آنکہ میرے حضرت جی حضرت باغ حسین کمالؒ منصبِ عبد تک پہنچے اور آپؒ کو وہ مقامات عطا ہوئے جو ہر کس و ناکس کا نصیب نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے آپؒ 'حالِ سفر' میں صفحہ (۱۲۳) پر رقم طراز ہیں:

> "حضورؐ نے فرمایا: جس غیر معمولی انداز میں تمھیں اویسی طریقہ پر کثیر تعداد میں نسبتوں اور اسنادِ خلافت وانعامات سے نوازا گیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اب تم اپنی خلافت کا اعلان کر کے ظاہری طور پر بھی رشد وتلقین کا سلسلہ چلاؤ۔ تمام نسبتیں ضم کر کے تمھارے نام سے تصوف وسلوک کا ایک نیا سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔"

۸/اپریل ۱۹۸۴ء سلسلہ اویسیہ کمالیہ کا یومِ تاسیس ہے۔ حضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی روحانی توجہ کے باعث یہ سلسلہ بہت تیزی سے اطراف وجوانب میں پھیل کر دلوں کو اُجالنے اور اخلاق کو سنوارنے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔

یہ تو معروف ومشہور سلاسل ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی بے شمار ذیلی سلاسل ہیں جیسے رفاعیہ، مولویہ، صابریہ، نظامیہ، شطّاریہ وغیرہ اور ان میں بڑے بڑے اولیائے عظامؒ کی ذواتِ بابرکات گزری ہیں۔ دراصل عشق ومستی کے ہزار اسلوب اور سپردگی کے بے شمار قرینے ہیں، ہر کوئی اپنے ذوقِ طبع کے مطابق اس کا اظہار کرتا ہے تاہم یہ تمام دریا بالآخر ایک ہی سمندر میں جا گرتے ہیں۔ بقولِ پروفیسر لطیف اللہ:

”تمام سلاسل اس امر میں متحد ہیں کہ سالک کا اصل مطلوب حق سبحانہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے جو اخلاقِ فاضلہ کی تصحیح اور تہذیب سے حاصل ہوتی ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کے طریقوں میں قدرے فرق ہے۔ کوئی سلسلہ کسی طریقے سے مقصود کو پاتا ہے اور کوئی کسی طریقے سے مراد حاصل کرتا ہے۔ غرض مقصود و مطلب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔“

(تصوف اور سرّیت ۔ ص ۲۱۱ ، ۲۱۲)

قرآنِ کریم نے خشیتِ الٰہی اور علم کو ایک دوسرے کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کا درجہ صوفیاء کے سوا تمام لوگوں سے بلند رکھا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (فاطر۔۲۸)

”اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو (اللہ کی ذات وصفات کا) علم رکھتے ہیں۔“

اہلِ علم جانتے ہیں کہ دورِ نبویؐ میں علوم وفنون اجمالی شکل میں موجود ہونے کے باوجود باقاعدہ مدوّن نہیں ہوئے تھے۔ جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور صرف ونحو کی تدوین ہوئی ایسے ہی صوفیانہ ادب نے انتہائی عرق ریزی سے قرآن و حدیث سے روشنی کشید کرتے ہوئے تصوف کے معاملات وانکشافات لوگوں تک پہنچا کر اُن کے اندر شمعِ طریقت روشن کی۔ اس مقام پر شائقین کے لیے تصوف کی چند نادر کُتب اور اُن کے مصنفین کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں تا کہ صاحبانِ ذوق استفادہ کر سکیں۔ حضرت ابو نصر سراجؒ کی گراں قدر تصنیف اللمع فی التصوف، حضرت ابو طالب المکیؒ کا تحفۂ جانفزا قوت القلوب' حضرت شیخ ابونعیم اصفہانیؒ کی طبقات الاصفیاء، رسالۂ قشیریہ از شیخ عبدالکریم قشیریؒ، سیّد علی بن عثمان ہجویریؒ کی کشف المحجوب، امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی غنیۃ الطالبین، فریدالدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیاءؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی عوارف المعارف،

مثنوی از حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی فوائد الفواد، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اخبارالاخیار، شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہؒ کی انفاس العارفین، حضرت مہرعلی شاہؒ کی شمس الہدایہ، حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی دلائل السلوک اور حضرت باغ حسین کمالؒ کی حالِ سفر، یہ سب سالکین کو شوقِ سلوک دلانے میں معاونت کرتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے نہ صرف شوق فزوں تر ہوتا ہے بلکہ جذبوں کو مہمیز بھی ملتی ہے۔ حقیقت میں قرآنِ کریم اور کتبِ حدیث کے بعد یہی کتابیں (بشمول چند اور) اسلامی تصوف کا نچوڑ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے مصنفین درجۂ ولایت پر فائز ہونے کے علاوہ متاعِ علم سے بھی آراستہ تھے اور اُنہوں نے اپنی ریاضت اور مجاہدات کا نچوڑ پوری دل نشینی کے ساتھ ان عبارتوں میں سمو دیا ہے۔ اب یہ طالب علم کی اپنی استعداد ہے کہ وہ ان سے کیا سیکھتا ہے۔ دراصل استفادہ کرنے کا جوہر بھی اللہ تعالیٰ کی عطاؤں میں سے ایک عطا ہے۔ سچی طلب ہی اس باب میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ مذکورہ کتابوں سے پہلے تصوف کا راہی اگر قرآن و حدیث اور فقہ سے معرفت حاصل کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ اخلاصِ نیت اُسے عمل سے روکے اور منزلِ سلوک میں کہیں بھی پاؤں لغزش کا شکار ہوں۔ قرآنِ مجید کو ٹھہر ٹھہر کر پوری توجہ سے تلاوت کرنا اپنی جگہ ثواب کا حامل ہے جبکہ آیات کی تفہیم و تفسیر بھی ذوق کو جلا بخشتی ہے۔ خاص طور پر وہ مدنی آیات جن میں یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کہہ کر مومنین سے خطاب کیا گیا ہے، نصیحت اور درس کا بہت دلکش انداز لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے اپنی تصنیف 'قرآن اور تصوف' میں بہت محنت سے ثابت کیا ہے کہ تصوف اُنہی لوگوں کا طریقۂ صادقہ ہے جو قرآنِ مجید کی سمجھ رکھتے ہیں اور اس کی رہبری میں سفرِ سلوک طے کرتے ہیں۔ یہاں مسافر اپنی معروضات مختصر کر کے ربِّ کریم کی عنایات کا شکر ادا کرتے ہوئے رودادِ سفر کا آغاز کرتا ہے۔

# سیرُالافلاک

عشق کی اک جَست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

۱۹۷۵ء فقیر کی مسافتِ سلوک کے باقاعدہ آغاز کا زمانہ ہے۔ والدِ گرامی، حضرت باغ حسین کمالؒ جیسے ولیٔ کامل کی آغوشِ کریمانہ کے صدقے صوفیانہ طرزِ حیات کی چاشنی خمیر میں رچی ہوئی تھی۔ سو ہوش سنبھالتے ہی حضرت جی ﷫ کی معیت میں حضرت مولانا اللہ یار خان ﷫ کی بیعت سے مشرف ہوا۔ پہلی تلقین ریاضت و مجاہدہ کی تھی۔ شیخِ محترمؒ نے فرمایا..... "طلب کی منزلوں تک باریابی کے لیے قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کے احکامات پر عمل کیجیے۔" سو آغازِ مسافت میں ہی اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ فرقانِ حمید کی تلاوت مقدم کر لی..... ۱۹۸۴ء میں حضرتِ موصوفؒ کی رحلت کے بعد حضرت جی باغ حسین کمالؒ، نبی کریمؐ کی خصوصی شفقت اور تربیتی عمل سے گزر کر بانیٔ سلسلہ کے اعزاز سے سرفراز ہوئے تو اس فقیر کو بھی اس عمل میں شرکت اور کچھ مراحل کے شاہد ہونے کا فخر نصیب ہوا۔ راقم نے ابتدا میں ہی اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ حضرت جیؒ کے دستِ حق پر بیعت کی سعادت پائی۔ شاعرانہ طبیعت نے اسے "بیعتِ کمال" کا نام دیا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا..... "بشریت کا تقاضا ہے کہ ذکرِ الٰہی اور درود شریف کو ہر شے پر مقدم رکھو۔" تعمیلِ ارشاد کا وعدہ اور دُعا کی درخواست کی۔

ایک رات خواب میں نبیؐ کریمؐ کی زیارت نصیب ہوئی، دیکھا کہ آپؐ فرمارہے ہیں "اللہ کریم نے تمہاری "بیعتِ کمال" والی اختراع کو پسند فرمایا ہے۔" عرض کیا"...... یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے ماں باپ آپؐ پرقربان، ان لمحات کی سرشاری کب میسر آئے گی جب اس عاجز کو آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل ہوگا۔" اتنا کہنا تھا کہ میری آنکھ کُھل گئی۔ ساری رات اور اگلے بہت سے شب وروز اسی بے چینی میں گزرے کہ وہ دربار جہاں ابوبکرؓ کی بزرگی، عمرؓ کے رُعب، عثمانؓ کی حیا اور علیؓ کے جلال کو تاب نہیں کہ اذن بغیر لب ہلاسکیں وہاں میں نے کیا درخواست کردی۔ دل نے کہا اپنے سفر کا تو خیال کیا ہوتا کہ ابھی شروعات ہیں اور یہ صدیوں کا سفر ہے۔ بے کلی اتنی بڑھی کہ کئی دن اس جسارت پر نادم رہا۔ بار بار معافی کا خواستگار رہا مگر دوسری جانب سے حضوری کا کوئی اشارہ تک نہ تھا۔

ان دنوں بے کیفی حد سے سوا تھی۔ تمام سرگرمیاں لایعنی محسوس ہوتیں، گھر میں جی نہ لگتا اور اکثر کوئی کتاب بغل میں دابے پڑھنے کے بہانے گاؤں سے ملحقہ کھیتوں اور کسیوں میں بھٹکتا پھرتا، اکثر لبوں پر ایک ہی فریاد رہتی:

ع حضورؐ بارِ دِگر بلاوا، حضورؐ پھر سے کرم کی بارش

اس ساعتِ سعید کی یاد آج بھی دل پر شبنم کی طرح برستی ہے جب شب وروز کی مناجات درجۂ قبولیت سے ہمکنار ہوئیں اور ماہِ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ کی ایک مبارک شب حضرت جیؒ نے دربارِ اقدسؐ میں پیش کیا۔ میں نے دوڑ کر پائے عرش مقامؐ چوم لیے اور اس قدر گریہ کیا کہ اہلِ محفل دلاسا دینے لگے۔ حضرت علیؓ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور اٹھنے کی تلقین فرمائی۔ خاتم المرسلینؐ، رحمت اللعالمینؐ کا بحرِ کرم جوش میں تھا۔ آپؐ نے فرمایا ....

"بیٹے! شدتِ عشق عطا کے دروازے جلد کھول دیتی ہے۔ آؤ بیعت کرو۔"

اللہ اللہ، کہاں مجھ ایسا بے نوا و بے مایہ، کہاں محبوبِ الٰہیؐ۔ میں ایک بار پھر پائے مبارکؐ میں گر پڑا اور اتنے بوسے لیے کہ زبان میں فردوسی ذائقہ اتر آیا۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ نے رسالت مآب ﷺ کی اجازت سے میرا ہاتھ پکڑ کر آپؐ کے دستِ نورانی پر رکھا اور فرمایا "بیٹے پڑھو"

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ ط

"بے شک جو لوگ آپؐ کے دستِ مبارک پر
بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے
بیعت کرتے ہیں۔" (الفتح۔۱۰)

دستِ مبارک کے لمس سے کیا کیا کیفیات وارد ہوئیں، نگاہِ فیض رساں نے کیا کچھ عطا کیا، اذن نہیں ورنہ بے خودی کہتی ہے کہ اہلِ دنیا کو بتاؤں کہ غلام کی حیثیت کیا ہے، بندگانِ عشق کا مرتبہ کیا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ سر آپ ﷺ کے قدموں میں پڑا رہے اور دم نکل جائے۔ عطائے ربانی اور فیضانِ نبویؐ کی برکت سے میری زبان پر وہ آیتِ مبارکہ جاری ہوگئی جو بیعتِ رضوان کی بشارت دیتی ہے:

لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَكَ
تَحۡتَ الشَّجَرَةِ (الفتح۔۱۸)

"بے شک اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جس وقت وہ
درخت کے نیچے آپؐ کی بیعت کر رہے تھے۔"

اس حضوری کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی۔

سلسلۂ روز و شب اپنی مخصوص رفتار سے جاری تھا۔ کچھ عرصہ رویائے صادقہ کے ذریعے اشاراتی تربیت کا معاملہ رہا جس کے بعد کیفیات نے ایک وجدانی رنگ اختیار

کرلیا اور چند نادر واقعات کے ذریعے آئندہ مُسافت کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ ایک واقعہ کا ذکر بطور تحدیثِ نعمت بے جا نہ ہوگا۔ قیامِ راولپنڈی کے پہلے دور میں ایک روز نمازِ عشاء کے بعد اوراد و وظائف میں مشغول تھا کہ نبی کریمؐ اکابرین کے ہمراہ تشریف فرما ہوئے۔ میں نے آپؐ کے نعلینِ پاک چومے اور سب حاضرین کی قدم بوسی کی۔ رحمتہ اللعالمینؐ میری طرف بڑھے اور مجھے کھڑا رہنے کا اشارہ فرمایا۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی مبارک انگشتِ شہادت سے میرے سینے پر لکیر جیسا لمس بنا دیا۔ مجھے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں اور یوں لگا جیسے میرا وقتِ آخر آ گیا ہے۔ پھر آپؐ نے اسی طرح ایک بار پھر انگشتِ مبارک سے اس عمل کو دہرایا۔ فقیر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس جہان میں نو وارد ہے اور یہ دنیا اس کے لیے نئی ہے۔ روح ایسے مصفّا ہو گئی جیسے یومِ الست میں تھی اور دل سے غرض کی آلودگی سراسر دھو دی گئی۔ الحمدللہ۔ آپؐ نے فرمایا ''بیٹے پڑھو، رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ o وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ o'' میرے تعمیل کرنے پہ آپؐ نے سینے سے لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا..... ''بیٹے، ہم نے آپ کو پاک کر دیا۔ لوگوں کی پاکیزگیٔ قلب پہ توجہ دیں اور اللہ کی شکر گزاری کو حرزِ جاں بنائے رکھیں''۔

میں نے مذکورہ واقعہ کا ذکر اپنے والدِ گرامی اور شیخِ محترم سے کیا تو آپؒ نے مبارک باد سے نوازتے ہوئے فرمایا ''بیٹے کتبِ تصوف میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ سالکین کو ان کے شیوخ نے مختلف طریقوں سے تطہیر کے عمل سے گزارا اور اویسیوں کو تو یوں بھی طویل وسیلوں کی ضرورت نہیں پڑتی، نبیٔ کریمؐ خود ان کی رہنمائی اور نگرانی فرماتے ہیں لیکن آپ پر ہونے والا کرم چیزے دیگر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مقدس سے شرحِ صدر کا ایسا واقعہ اس سے پہلے کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔''

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال (۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء) اور اپنی دستار بندی (۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء) کے بعد مسلسل امتحاناتِ ظاہری و باطنی کا سامنا رہا اور چند وابستگانِ سلسلہ کی ترجیحات میں تغیّر کے سبب سلسلۂ عالیہ کی حقیقی روح متاثر ہوتی نظر آئی تو کچھ مشائخ، سلسلۂ عالیہ کو کم از کم سو سال کے لیے موقوف کرنے کی تجاویز پر غور کرنے لگے۔ ایسے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقیر کی درخواست پر اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا اور بالآخر میری معروضات پر اظہارِ اطمینان کے بعد استقامت اور ثابت قدمی کی دعاؤں کے ساتھ عارضی ہجرت کا حکم صادر فرماتے ہوئے اکابرین کو توجہ میں اضافے اور اس بحث کے خاتمے کی خصوصی تلقین فرمائی۔

ایک روز دورانِ مراقبہ باریابی ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا ..... ”سلسلہ اویسیہ مختلف زمانوں میں تعطّل کا شکار رہا ہے لیکن ان شاء اللہ اب سلسلہ اویسیہ کمالیہ تا قیامت جاری رہے گا۔“ تمام حاضرین نے ”سبحان اللہ“ کہا اور فقیر کو مُبارک باد دی۔ اس اثناء میں ایک نورانی بزرگ ہاتھوں میں نہایت خوش رنگ سنہرے مشروب کے بلوریں گلاسوں پر مشتمل طشت تھامے واردِ خدمت ہوئے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقیر پر متبسم نگاہ ڈالتے ہوئے دریافت فرمایا ..... ”کیا انھیں پہچانتے ہیں؟“ میں نے دست بستہ عرض کی ”یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگرچہ اس سے قبل ان کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا لیکن دل گواہی دے رہا ہے کہ صدیوں کی شناسائی ہے۔ جب یہ تشریف لائے تو ان کے لبوں پر تبسّم تھا، نور کی ایک لکیر نکل کر میرے سینے پہ پڑی جو تطہیرِ قلب کے سِوا کچھ نہیں۔ میں نے آپؐ اور اصحابِ کبارؓ کے علاوہ اتنے خوبصورت اور پُرنور دندانِ مبارک کبھی نہیں دیکھے۔“ اتنا کہنا تھا کہ سرورِ انبیاءؐ نے میرے سر پر محبت سے اپنا دستِ شفقت رکھا اور فرمایا ”ٹھیک ہے ہم یہ شربت آپ کو انہی کے ہاتھوں پلائیں گے۔“

پھر حاضرین سے استفسار کیا "اب آپ کا کیا خیال ہے۔" خلفائے راشدینؓ نے بیک آواز فرمایا...... "بے شک امتحان کامیاب رہا، ہمارے خدشات دور ہو گئے۔" اس گفتگو کے دوران میں حیران سا مؤدب کھڑا رہا۔

سرکار ﷺ نے فرمایا..... "بیٹے میرا خیال تھا کہ سلسلہ اویسیہ کو تسلسل عطا کر کے عالمِ اسلام کے روحانی و تکوینی امور آپ کے سپرد کر دیے جائیں لیکن ضروری تھا کہ پہلے امتحان ہو جائے۔ الحمدللہ آپ کامران ٹھہرے۔" ہر جانب سے مبارکباد کی صدائیں بلند ہوئیں اور میں نگوں سار کھڑا رہا۔ پھر جوشِ عقیدت میں نبیٔ کریم ﷺ سے لے کر تمام حاضرین کے مبارک ہاتھ چومے۔ جب صاحبِ طشت بزرگ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو انھوں نے حضورؐ کا اشارہ پا کر سینے سے لگا لیا۔ میری یہ حالت کہ اشک تھمتے نہ تھے۔ عنایات اور وہ بھی دربارِ اقدسؐ سے، جذبات کا ایک جوار بھاٹا تھا لیکن میں خاموشی سے دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کرتا رہا۔

کچھ دیر مزید گزری تھی کہ آپ ﷺ کے لب ہائے مبارک ہلے اور فرمایا......
"تابش بیٹے! یہ اویس قرنیؓ ہیں۔ آپ کا امتحان یہی تھا کہ اپنی نسبت کی جانب آپ کی کشش کتنی ہے۔" میں ایک بار پھر عاشقِ صادقؓ کے سامنے جھکا تو انھوں نے میری دونوں جانب بوسے لیے اور وہ کچھ انعام کیا جو بیان سے باہر ہے۔ عطا کرتے جاتے اور جنابِ رسالتمآبؐ کی جانب دیکھتے جاتے۔ حضور ﷺ ان کے ہر کلمے پر "آمین" کہتے جس کے بعد صحابہ کرامؓ بھی پیروی فرماتے۔ آخر میں نبیٔ کریمؐ نے فرمایا .....
"بیٹے اس سے قبل یہ معاملات کمال صاحب (حضرت جیؒ) سرانجام دے رہے تھے۔ اب ان امور کو وہ برزخ سے دیکھیں گے۔ عالمِ ظاہر میں ہونے کے باعث یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کی جاتی ہے۔ آپ (حضرت) علیؓ اور میرے ماتحت کام کریں گے اور اپنی

کارکردگی کی اطلاع دیں گے۔ تمام اصحابِ کرامؓ اور اولیائے عظامؒ کی رہنمائی اور معاونت آپ کے شاملِ حال رہے گی۔ باقی تفصیلات (شیخ) عبدالقادر جیلانیؒ اور (حضرت) باغ حسین کمالؒ بتادیں گے۔ آپ کا مشن فروغِ اسلام اور اس کے خلاف سازشوں کی بیخ کنی ہے۔ سب سے پہلے پاکستان کے استحکام کو یقینی بنائیں۔''

میں جان گیا کہ ایک انتہائی دشوار کام میرے ذمے ہوا ہے۔ اسی تذبذب کے عالم میں گزارش کی..... ''یارسول اللہ ﷺ آپ کا حکم سرآنکھوں پر مگر تمام بزرگ اتنی ارفع شان والے ہیں کہ انھیں کوئی ذمہ داری سونپتے ہوئے میرا قد میرے آڑے آجائے گا۔'' نبیٔ کریمؐ نے متبسم انداز میں فرمایا...... ''بیٹے تردّد کی ضرورت نہیں، اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیں۔ آپ کو چند حضرات کی ایک فہرست دے دی جائے گی۔ فوری طور پر ان کی ڈیوٹی لگا کر مجھے رپورٹ دیں۔''

بات دراصل یہ ہے کہ ارواحِ مقدسہ کا فیض اُن کی ظاہری پردہ پوشی کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور اہلِ زمین کے معاملات ان کے روحانی تصرف کی بدولت ہی بہتری کی جانب گامزن ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حکمتِ الٰہی ہے کہ انتظامی امور کی ظاہری باگ ڈور بہر حال ایک زندہ شخص ہی کے حوالے ہوتی ہے اور وہ دربارِ اقدسؐ سے تفویض کردہ امور کے سلسلہ میں نیک ارواح، رجال الغیب اور اہلِ برزخ کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ جو ذمہ داری میرے سپرد فرمائی گئی وہ اتنی کٹھن تھی کہ بظاہر کامیابی کے امکانات معدوم تھے مگر حضرت جیؒ اور جنابِ غوث الاعظمؒ نے دلاسا دیا تو ہمت بندھی۔

ایک روز حاضری کی نوید ہوئی تو میں دست بستہ بارگاہِ عالی مقام ﷺ میں پہنچا۔ حضرت علیؓ نے حضورؐ کے اشارۂ مبارک سے ایک زرفشانی ورق میری جانب بڑھایا

جسے ادب سے تھام کر آنکھوں سے لگانے کے بعد پڑھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بعینہٖ انہی دس ناموں کی فہرست تھی جو حُسنِ اتفاق سے میرے ذہن میں تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا .......... ''ایران، ترکی، مصر اور چین پر خاص توجہ دیں (بعد میں روس بھی اس فہرست میں شامل کر دیا گیا۔) مقررہ مدّت میں سارا کام مکمل ہونا چاہیے۔ (حضرت) علیؓ آپ کی سرپرستی فرمائیں گے۔ فوری رہنمائی کے لیے اپنے شیخ (حضرت) باغ حسین کمالؒ سے مشورہ کر لیا کریں۔'' میں اجازت کے لیے جھکا تو سرکارؐ نے ماتھا چوما اور فرمایا..... ''زمین پر کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو برزخ اور افلاک کے تمام منطقے دکھا دیے جائیں تا کہ بعد کی تمام منازل آسان ہو جائیں۔ آپ کا سفر کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے۔''

دربارِ اقدسؐ سے واپس آتے ہی دنیا کو دس حصوں میں تقسیم کیا اور تمام بزرگوں سے روحانی رابطہ کر کے ہر علاقہ ایک محترم کی نگرانی میں دے دیا۔ ان جلیل القدر ہستیوں نے محبت اور خلوص کے ساتھ تعاون کا یقین دلایا اور شفقتوں سے نوازا۔ فقیر کو تفصیلی بیان کا اذن نہیں، کچھ وضاحت بھی اس لیے کی کہ بنیاد قائم ہو سکے۔ یوں بھی راقم حالِ سفر اختصار کے ساتھ کہے گا کہ شوق و ذوق کے حامل اپنی اپنی استعداد کے مطابق نکات کو کھولیں اور حسبِ توفیق فیض پائیں۔

فقیر کے مشاہدات کا آغاز ارضی سیر سے ہوا۔ ہفت بحر کا ایک ایک عالم، قطرہ قطرہ کھولا گیا تا کہ زائر عجائبات ملاحظہ کرتے ہوئے تسبیح کرتا چلے۔ تلخ و شیریں ذائقوں میں قدرت نے کیا کیا نشانیاں رکھیں کہ زمین بٹ گئی اور بعد میں یہی بحور براعظموں کی تقسیم کا باعث بنے۔ ہر دریا میں اس خطۂ ارضی کا ذائقہ تو ہے ہی جس پر وہ بہتا ہے لیکن کہیں لطفِ پروردگار کے فسوں ساز آثار ہیں اور کہیں ہیبتِ کبریا کی دلخراش جھلکیاں۔ کچھ ایسے ہیں جن کی بُوئے آب سے جان دار بے جان ہو جائے اور کچھ ایسے کہ نافع اور افزائش و پرورش کرنے والے ہیں۔ پھر ان کے بہاؤ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں کچھ اس انداز اور ترتیب کے ساتھ رکھے گئے جن کی شاخیں بھی تہذیب اور تنظیم کی مدح خواں دکھائی دیتی ہیں۔ مسافر نے شور و شیریں بحور کے عجائبات دیکھے، روح پرور اور حیرت افزا مخلوقات کا مشاہدہ کیا اور احمر و اخضر کی نشانیاں ملاحظہ کیں۔ روشنی اور تاریکی کا حال کُھلا تو منبع البحرین، مجمع البحرین اور ان سے متعلقہ آیاتِ قرآنی کے مخفی مفاہیم کی گُل پاشی ہونے لگی۔ منبع البحرین میں حضرت ابراہیمؑ کی ذاتِ بابرکات کی طرف اشارہ ہے جن کی اولاد میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی صورت رحمتوں اور برکتوں کے دریاؤں سے عرب و عجم سیراب و شاداب ہوئے۔ عطاو خیر کا سلسلہ دراز ہوا تو جنابِ شیرِ خداؓ اور سیدۃ النساءؓ کی یکجائی مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ کہلائی اور لُؤلُؤُ وَالمَرْجَان یعنی حسنینِ کریمینؓ کی تشریف آوری کا باعث بنی۔ بے شک چشمۂ حیات ذاتِ باری تعالیٰ کی عجیب اور عظیم نشانی ہے۔ دو پانیوں کے

درمیان، ابدی زندگی دینے اور ہمیشگی و سرشاری عطا کرنے والا قدرت کا نادر شاہکار۔ اس دوران کھلا کہ ملاپ سے ہی زندگی کی نشو و نما ہے۔ بحور کے وصال کا مقامِ خاص، حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی جائے ملاقات 'مجمع البحرین' دیکھنے اور جنابِ خضرؑ سے ملنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ آپؑ کو پہچان کر عرض کی..........

''عشق حیاتِ ابدی ہے اور یہ عاجز اس پانی کو چلتے دیکھ کر عاشقِ حقیقی کا توکّل یاد کرتا ہے۔ توکّل ہی ابدی زندگی ہے اور وصال کو فنا نہیں۔''

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا

توکلت علی اللہ تعالیٰ

فرمایا..... ''یہ وصل کی خواہش ہی تو ہے جو مومن کو توکّل عطا کرتی ہے۔ وہ اُسی کی جانب دیکھتا ہے جو آخر کار اسے اپنا جلوہ دِکھائے گا۔'' پھر آپؑ نے فقیر کو دعوت دی ''اس میں سے اگر کچھ پینا ہے تو اجازت ہے۔'' عرض کیا ''اے رہنمائی کرنے والے! ہم اُمتِ عظمیٰ کے حقیر سہی لیکن فخرِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ پاک سے بڑھ کر کون سا جامِ حیات ہے جو ابدی کیف دے۔ خدا شاہد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں بیتا ہوا ایک ایک پل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد میں گزری ہوئی ایک ایک گھڑی ہزار صدیوں سے بڑھ کر ہے۔'' ستائشی انداز میں فرمایا...... ''آپ معیارِ عشق پر پورے اترے۔ بے شک محمدِ عربیؐ کی اطاعت میں زندگی بسر کرنے والے حیاتِ جاودانی پائیں گے۔ میری دعا ہے کہ ربِ کریم رسولِ پاکؐ کے عقیدت مندوں کی یہ شان سلامت رکھے۔''

میں نے دریائے اسود کی بابت حضرتؑ سے دریافت کیا اور اس کے اخفاء کو مصلحتِ ربّانی جان کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بحرِ اسود گویا ارضی سطح پر شانِ احدیت کا جلال ہے۔ ابتدا و انتہاء سے ورا، ادراک سے بالا، صفات کے لیے محال اور ذات کا اظہار۔

یہاں کی مخلوق عجب العجائب ہے جبکہ احمر و اخضر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک معاون اور مونس دوسرا مخلوق سے خالی اور مہلک حتیٰ کہ ارد گرد والوں کو بھی پناہ نہ دینے والا۔ احمر ہمدم، غم خوار اور دوست ہے، سُچے موتیوں سے بھرا ہوا، مومنین کو جگہ دینے، روح کو سہلانے اور ان کے لیے راستے کھولنے والا۔ راقم کو اس کے پانی میں مادرانہ شفقت، پدرانہ انس اور دوستانہ رنگ نظر آیا۔ وہاں فہم کو زیبائی و نکتہ رسی حاصل ہوتی ہے اور گرہیں کھلنے لگتی ہیں، خصوصاً "دل دریا سمندروں ڈوہنگے" کی حقیقت اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ مطلعِ ذہن پہ روشن ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اخضر دلدل کی طرح اپنی طرف کھینچتا اور ہلاکت خیز تباہی سے دوچار کرتا ہے۔

اَلْاَمَانْ ۔ اَلْحَفِیظْ ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر

مسافر نے بقدرِ ذوق سیر کے مزے لوٹے اور بفضلِ الٰہی رموزِ آب سے آگاہی حاصل کی۔ جب اپنی فرشی و عرشی مسافت مکمل کر کے لوٹا تو معلوم ہوا کہ دریاؤں اور آسمانوں کی کیفیت و حالت میں بہت مماثلت و مطابقت ہے۔ یوں ارض و سما کا حُسنِ توازن مزید واضح ہوا اور صناعِ کامل کی حمد کا نیا موقع ہاتھ آیا۔ شعر کا ذوق ہے اس لیے راقم تلازمے کے پردے میں بعض رشتوں کو جان لیتا ہے۔ گویا فنِ شاعری اگر حقیقی طلب کا حامل ہو تو معنی کی پرتیں کھل جاتی ہیں۔

ع شاعری جزو ایست از پیغمبری

دریاؤں کا وظیفہ اس لیے کیا گیا کہ انواع و اقسام کے باب میں خالقِ زمان و مکاں کی ثناء منظور تھی ورنہ عجائبات اور مظاہر کا شمار انسانی ذہن سے بہت بالا اور بعید ہے۔ زائران سے گزر کر زمینوں کی سیر کو نکلا جس کا اذن دربارِ اقدسؐ سے ملا تھا۔

طبقاتِ سبعہ میں تہ در تہ بچھی زمین حیرت و استعجاب اور عظمت و کبریائی کا مقام ہے۔ فقیر نے اِن زمینوں کو ایک دوسرے سے یکسر مختلف پایا اور دیکھا کہ رنگ، ہیئت، کیفیات، اثر، مخلوق اور نوع کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ پہلے طبقے میں ذی نفس قیام پذیر ہیں۔ یہاں خاکستری رنگ چھایا ہوا ہے حال آنکہ ابتدا میں یہ بیضہ سے زیادہ اُجلا اور نافے سے بڑھ کر مہکار کا حامل تھا۔ اس کا بنیادی رنگ بدل جانے کے باوجود اللہ نے اِسے طبقات الارض میں سب سے بلند مرتبہ عطا کیا ہے کہ یہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مقیم و فروکش ہوئے اور کلمۃ اللہ کی بنیاد پڑی۔ ایک حصہ خشکی اور باقی سب پانی ہے۔ یہاں ظلمات میں یاجوج ماجوج ہیں جو نفسی حصار میں ہیں۔ چاٹتے جاتے ہیں مگر دیوار ہے کہ پھر بھی قائم ہے۔ مسافر کو بتایا گیا کہ نزولِ مہدیؑ تک یہ عمل یونہی جاری رہے گا بالآخر یہ قتل ہوں گے۔ یہ بشارت بھی دی گئی کہ لشکرِ مہدیؑ کا ہراول دستہ ذاکرین پر مشتمل ہوگا اور نمایاں خدمات سرانجام دے گا۔ حقیقتِ سلوک سے ناآشنا قاری اس بات پر حیرت و استعجاب کا اظہار کر سکتا ہے لیکن ذاکرین کی اہمیت کے حوالے سے حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ترمذی شریف کی یہ حدیثِ مبارکہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا ''قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کون سی عبادت سب سے افضل ہوگی۔'' آپؐ نے ارشاد فرمایا ..... ''کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والوں کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔'' اسی طرح 'مسلم شریف' کی یہ حدیثِ مبارکہ بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے:

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃَ حَتّٰی لَا یُقَالُ فِی الْاَرْضِ عَلٰی اَحَدٍ یَقُوْلُ اَللّٰہَ اَللّٰہَ

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک دنیا میں ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا موجود ہے۔“

اجتماعی ذکر کے حوالے سے بخاری شریف کی یہ حدیث خاص طور پر توجہ کی حامل ہے:

لَا یَقْعُدُ قَوْمٌ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا حَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَنَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ ھُمُ الْقَوْمُ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ

”جب کچھ لوگ مل کر ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں تو ملائکہ انھیں ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے اور سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ملائکہ میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ایسی جماعت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں رہ سکتا۔“

ان احادیثِ مبارکہ سے ذکرِ الٰہی کی اہمیت، اولیائے کرامؒ کی ہم نشینی اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی برکات واضح طور پر اجاگر ہوتی ہیں، حتیٰ کہ ........ ”صحبت صالح ترا صالح کند“ کے تحت اللہ والوں کی صحبت ہی اتنی سود مند ثابت ہوتی ہے کہ انسان حاملینِ حُبِ الٰہی میں شمار ہونے لگتا ہے۔ فقیر کے خیال میں کسی اللہ والے سے شرفِ ملاقات کے بغیر عقیدت و ارادت رکھنے والے بھی فیوض و برکات کی چند کلیاں چن ہی لیتے ہیں لیکن باقاعدہ تربیت کے لیے صحبتِ شیخ بہر حال ناگزیر ہے۔ دراصل صحبتِ شیخ، کتابِ عشق کا پہلا اور لازمی باب ہے اور اس میں ان گنت فوائد و ثمرات پوشیدہ ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ روحانی زندگی کا دیباچہ اور نقطۂ آغاز ہے۔ بعض اکابرینِ تصوف کے نزدیک تو اسے فرض کا درجہ حاصل ہے۔

شمال یعنی اُتر کی زمین ابھی تک اسی طرح اُجلی ہے جیسا کہ ابتدا میں تھی۔ یہیں دراصل حضرت خضرؑ کی شاہی ہے البتہ کہیں بھی جا سکتے ہیں کہ فی زمانہ یہ اقلیم انہی کے حکم میں دی گئی ہے۔ طبقۂ اوّل کا یہ حصہ برگزیدہ مخلوق کا مسکن ہے۔ یہاں فقیر کو اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مفہوم سمجھ آیا۔ مسافر نے ابتدائی ارضی رہائش کو سلام کیا تو جواباً اُمتِ مسلمہ پر سلامتی بھیجی گئی اور ذاتی حوالے سے بہت سی خبریں دی گئیں۔

زمین کا طبقۂ دوم اہلِ ایمان جِنّوں کا مسکن ہے۔ یہاں ہر طرف عشق اور ہریالی کا راج ہے جس کے باعث طبع لہلہا اٹھتی ہے اور دوام کا احساس ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ربِّ کریم کی قدرت ہے کہ یہ جن، انسان کے بنیادی جوہر یعنی حب اللہ، عشقِ رسولؐ اور جذبۂ ایمانی کی تاب نہیں لا سکتے لہٰذا کلمہ گو ہونے کے باوجود پیچ و تاب کھاتے اور عداوت پر مائل رہتے ہیں۔ البتہ اتنا ہے کہ راقم نے وہاں کسی جن کے ہاتھوں انسان کی ہلاکت اور ایذا ملاحظہ نہیں کی جیسا کہ بعض کُتب میں مرقوم ہے۔ ممکن ہے ان مصنفین کے تجربات میں ایسے واقعات آئے ہوں، واللہ اعلم بالصواب۔ راقم نے مشاہدہ کیا کہ اس طبقۂ زمین میں روز و شب کے اوقات طبقۂ اول سے مختلف ہیں۔ لہٰذا یہاں ہنگامِ عبادت و ذکر میں تبدیلی لازم ہو جاتی ہے۔

پاندھی تیسرے طبقے میں پہنچا تو دیکھا کہ اس کے زعفرانی رنگ کے باعث ہر طرف زردی اور اداسی خیمہ زن تھی۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے حالات دوسرے طبقے سے یکسر جُدا ہیں۔ ایمان کی رمق نہیں، ہر جانب کفر و الحاد کی نحوست ہے۔ یہاں کے جن طبقۂ اوّل میں جا کر گمراہی اور شرک پھیلاتے ہیں اور انسان کی صورت بدل کر یوں گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی شناخت صرف عارف ہی کر سکتا ہے سو ایمانِ کامل والی آبادی کا رُخ نہیں کرتے۔ انھوں نے اس عاجز کو دیکھا تو دُور بھاگے۔ بسم اللہ شریف اور درودِ پاک

کا حصار مسافر کو حفاظت میں لیے مُشاہدہ کراتا رہا اور دیکھا کہ نہایت کراہت بھری صورتوں کے حامل ہیں اور تجلّیاتِ اسمائے حُسنہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ نور سے بھاگتے ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ باطل پر ہیں، شرک سے کنارہ نہیں کرتے۔ فقیر نے اپنے شیخِ محترم کے تتبع میں دعوتِ حق کا آغاز کیا اور الحمدللہ جنات کے بے شمار قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت خضرؑ پہلے ہی وظیفہ 'والناس' کی اجازت مرحمت فرما چکے تھے سو پڑھتا جاتا اور بڑھتا جاتا۔ یہ جائے عبرت ہے اور پناہ مانگنی چاہیے تاکہ باری تعالیٰ نبیٔ کریم ﷺ کے صدقے کشادگیٔ قلب عطا فرمائے۔ یہاں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کی تفہیم بھی ہوئی اور بتایا گیا کہ مُہر کیے گئے دلوں میں انسانوں کے علاوہ جنات کے قلوب بھی شامل ہیں۔ اس طبقہ کے مشرک جن کسی صورت مومنین کی شکل میں نہیں آسکتے تاہم اس کام کے لیے اُنھیں ضعفِ ایمان میں مبتلا کئی انسان میسّر آجاتے ہیں۔ فقیر اس مسافت پہ روانگی سے قبل اپنے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے فرمایا کہ سورۃ الناس کی تلاوت ایمان کی پختگی کا باعث بنتی ہے اور اگر اس سے پہلے سورۃ اخلاص بھی پڑھ لی جائے تو سفر آسان رہتا ہے۔

زمین کا چوتھا، پانچواں اور چھٹا طبقہ سفلی مخلوقات کا ٹھکانا ہے۔ ان زمینوں پر بالترتیب لال، نیلا اور سیاہ رنگ چھایا ہوا ہے جو دغا، فریب، قتل و غارت اور گمراہی کا آئینہ دار ہے۔ یہاں کراہت اور سفلے پن کا احساس نمایاں ہے۔ ان طبقات کے جنات و شیاطین بھٹکے ہوئے اور صراطِ مستقیم سے یکسر دُور ہیں۔ ان کا تو کام ہی ہلاکت، شرک اور کفر کی تعلیم دینا ہے۔ چھٹے طبقے میں تیرگی اس قدر غالب ہے کہ نورِ ایمان ہی رہنما ہو تو راستہ سجھائی دے ورنہ بھٹکتے دیر نہیں لگتی۔ یہاں کے انتہائی سرکش و نافرمان باسی مٹی، آگ، ہوا وغیرہ سے یوں خلق کیے گئے ہیں کہ عناصر کی کارفرمائی پر عقل دنگ رہ جاتی

ہے۔ کچھ فریب و مکر میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کچھ خدشات اور وسوسے پیدا کرتے اور شبہات میں ڈالتے ہیں۔ بعض حدودِ عنصری سے باہر نہیں نکل سکتے سو خود کو کوسنے اور اپنا سر پھوڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ چند ایک نکلتے ہیں اور انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان گروہوں پر کوئی نہ کوئی ابلیس حاکم ہے جو انھیں مکروہات ولغویات کی تربیت دیتا ہے۔ سب سے اوپر وہ ہے جس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ شیاطین کا یہی سرغنہ انھیں احکامات دے کر مختلف کاموں پر مامور کرتا ہے جن کی انجام دہی میں یہ کمزور اہلِ ایمان پر یلغار کر کے پے در پے بدعات ومنہیات میں مبتلا کر ڈالتے ہیں۔ راقم نے انھیں دیکھ کر جان لیا کہ ابلیس کی ذریت ہے لہٰذا ہر مقام پر لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم کو وردِ زبان رکھا اور یوں محفوظ رہا کہ فقیر کو دیکھ کر گویا دانت کچکچاتے تھے مگر ہیبتِ حق اور قوتِ ایمان کے باعث دم نہ مار سکتے تھے۔ خالقِ کائنات نے انسان کی عبرت کے لیے کیا کچھ سامان کر رکھا ہے اور مومن کو ایسی قوتِ ایمانی سے نوازا ہے کہ شیاطین ومنکرین اس کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔

الغرض ان طبقات کے شیاطین کی اقسام بے شمار ہیں۔ لالچ، جُرم، گناہِ کبیرہ کی ترغیب دینے اور شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے۔ یہ عبادت سے روکتے ہیں اور ایسا ڈھنگ اختیار کرتے ہیں جو طمع دار کو گھیر کر لعنت آمیز رنگینی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی معصیت کا ارتکاب ان کا پسندیدہ عمل ہے اور وہ اس کی ترویج میں یوں مگن ہیں کہ صرف اللہ کا کرم اور حضور ﷺ کی شفقت ہی ان کے شر سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ انھیں دیکھنے والا کراہت کے سبب سُدھ بُدھ کھو بیٹھے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ہمہ وقت انسان کے تعاقب میں رہتے ہیں تاکہ اُسے سرکشی پر آمادہ کر سکیں۔ کچھ چکمہ دے کر بھٹکاتے اور آناً فاناً انسان کی منزل کھوٹی کر دیتے ہیں۔

ایک غافل انسان ان کے حسبِ منشاء ہر خطا و تقصیر کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے مگر ضعفِ ایمان اس کے سوچنے کی صلاحیت ہی سلب کر لیتا ہے اور ہوش آنے پر اسے شدید حیرت و ندامت محسوس ہوتی ہے۔ مسافر نے ایسے شیاطین بھی دیکھے جن کی موجودگی صرف روح محسوس کر سکتی ہے اور تنگی میں معلوم ہوتا ہے کہ جکڑن سخت ہے۔ الامان، الحفیظ ۔ یہ بہت قوی ہیں، مرکز پر حملہ کرتے ہیں۔ ان کے گرو نے انھیں بتا رکھا ہے کہ اصل مقام روح ہے جہاں پر لگی ہوئی ضرب انسان سے ہوش وحواس چھین لیتی ہے۔ انسانوں میں ان کے نمائندے بہت شیریں گفتار اور بظاہر اللہ کی قسمیں کھانے والے ہوتے ہیں مگر درحقیقت تنازعات پیدا کرنے والے اور اللہ سے دور لے جانے والے۔ سورۃ البقرہ (۲۰۴۔۲۰۵) میں ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ○
وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ
الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ط

"انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، دنیاوی زندگی کے بارے میں جن کی باتیں تمہیں تعجب میں ڈال دیتی ہیں اور اچھی لگتی ہیں۔ جو اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ سخت ترین دشمن ہیں اور جب وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کرتے ہیں اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرتے ہیں۔"

راقم نے دیکھا کہ نافرمانی ان کے خمیر کا جزوِ اعظم ہے۔ جس کام سے روکا جائے قصداً وہی کرتے ہیں اور خیر کی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ شر اس قدر غالب ہے کہ اس

کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتے اور سفلی حرکات کے شوق میں بڑھ چڑھ کر بازی لے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ سیاہ بختی نافرمانی کی سزا میں ان کے لیے مقرر کر دی گئی ہے اور اب وہ اسی نہج پر خلقِ خدا کو بھی ورغلاتے اور بہکاتے رہیں گے۔

ساتویں طبقے میں فقیر نے ایذا دینے والے ایسے شیاطین دیکھے جن کے آس پاس عقرب اور مار تھے۔ ان کی جسامت اور ہیبت بیان سے باہر ہے۔ چٹانوں سے بڑھ کر قوی الجثّہ اور اس قدر وسیع الجسم کہ دھرتی پر ان کی موجودگی عذابِ الٰہی کا اشارہ ہے۔ گویا جہنم کا ایک نقشہ فردوس کے تضاد میں زمین پر گڑا ہوا ہے۔ ربِّ کریم نے اپنی حکمت سے کرۂ ارض پر جنت و دوزخ کے نمونے بطور عبرت و رغبت یوں رکھے کہ توازن پر زائر کے منہ سے کہیں سبحان اللہ نکلتا ہے تو کہیں 'استغفر اللہ' کی صدا بے اختیار لبوں سے پھوٹ پڑتی ہے۔ بے شک وہ نعیم اور جحیم کا خالق، مالک اور مختار ہے اور ہر شے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ سالکین کے لیے اس نکتے میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ اس قہار و جبار اور ستار و غفار کی شانِ بے نیازی کے مناظر دیکھیں اور ریاضت و مشاہدہ اور عبادت و مجاہدہ میں اضافے کے لیے استعداد بڑھائیں۔

زائر نے تحت الثریٰ تک سیر کے دوران وہ مخلوقات دیکھیں جن کی ہیبت سے انسان کا دم نکل جائے مگر سالک پر نگاہِ شیخ مہربان ہو تو تائیدِ الٰہی کی بدولت وہ زمرۂ لایحزنوں میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اس پر کوئی خوف، سوائے اللہ کے، نہیں ہوتا۔ مظاہر کی ہیبت اسے تسبیح کی ترغیب دیتی ہے اور ان کی ہولناکی عجائب سے دلچسپی میں بدل جاتی ہے۔ زمینوں کی سیر کے دوران عجیب کیفیات وارد ہوتی ہیں اور نکتے لطفِ الٰہی کے سبب کھلنے لگتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی یہ عظمت زائر پر اس لیے منکشف ہوتی ہے کہ وہ جلالت کے اسرار پا سکے۔ بے شک وہ معبود ہے اور ہم بندے۔ اپنے

پروردگار اور مالک و مختار کی بندگی ہماری ضرورت اور پہچان ہے اور یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں افضل ترین اُمت میں شامل فرمایا اور صراطِ مستقیم سے آشنا کیا۔ پھر صد شکر کہ اشرف ترین درجے پہ فائز فرما کر بہترین صورت پر خلق فرمایا۔ سو اب انسان پر لازم ہے کہ وہ رشکِ ملائکہ بنے، بندگی کا شوق بڑھائے اور فرائض پر توجہ مرکوز رکھے کہ اس لطیف و کریم اور غفار الذّنوب کا دریائے جُود و کرم اپنے بندے کی عبادت و ریاضت کے صدقے گناہگاروں کی معصیّت کو بھی دھو ڈالتا ہے اور یوں سیراب و شاداب کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی حاجت نہیں رہتی۔ مومن کی اصل شان ہی یہ ہے کہ غیر اللہ کا تصوّر محو ہو جائے اور قلب و روح، بدن کی رفاقت میں اسی کی جانب جھکیں جو کاشف القُلوب بھی ہے اور خالقِ روح و بدن بھی۔

فقیر نے زمینوں کے اسرار و احوال جس تفصیل سے مشاہدہ کیے انھیں اتنی صراحت سے بیان نہیں کیا کہ اذن سے تجاوز نافرمانی ہے۔ دمِ تحریر فقیر نے گرچہ تشنگی نہیں رہنے دی پھر بھی بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اس اظہار میں بوجھل اصطلاحوں سے قصداً گریز کرتے ہوئے نسبتاً سہل اندازِ بیان اختیار کیا ہے تا کہ قاری کو مفہوم تک رسائی میں آسانی ہو۔ یوں بھی ہر سالک اور قاری کسی کی روحانی مسافت اور قلبی کیفیت کی تصدیق و تائید کا اہل نہیں ہوتا۔ صاحبانِ توفیق ہدایت، نفع اور اپنے اطمینان و تسلی کے لیے اہلِ علم اور اہل اللہ کی معروف تصانیف دیکھیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ روحانی مسافت و انکشافاتِ باطنی کے ضمن میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ احمد سرہندیؒ اور دیگر اکابرین کی تحریریں سند کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کا مطالعہ قاری کو حدِ یقین تک لے جاتا ہے۔ اس حوالے سے امام غزالیؒ کا یہ اقتباس بطور نمونہ کافی ہے:

”حقیقت یہ ہے کہ عالمِ بیداری میں بھی اگر کوئی شخص ریاضت و مجاہدہ سے کام لے اور دل کو غصہ و شہوت اور اخلاقِ بد کے چنگل میں نہ پھنسنے دے۔ اس جہاں سے روگرداں ہو کر گوشۂ خلوت اختیار کر لے، آنکھیں بند کر لے اور حواس کو معطل کر دے اور دل کی عالمِ ملکوت سے مناسبت پیدا کرے اور وہ یوں کہ ہمیشہ اور مسلسل زبان کی بجائے دل سے اللہ اللہ کہا کرے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جائے اور سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے کسی چیز کی سُدھ بُدھ نہ رہے، تو خواہ وہ بیدار ہی کیوں نہ ہو، روزنِ دل اس پر کشادہ رہے گا اور جو کچھ دوسرے لوگ خواب میں دیکھتے ہیں وہ اسے بیداری میں دیکھے گا اور ارواحِ نیک اور فرشتے اسے حسین و جمیل صورتوں میں دکھائی دینے لگیں گے۔ ایسا شخص پیغمبروں کو بھی دیکھنے لگتا ہے اور ان سے فوائد حاصل کرتا ہے اور ان کی امداد سے مشرف ہوتا ہے اور فرشتے زمین و آسمان کے ہر گوشے کو اس پر بے نقاب کر دیتے ہیں اور جس شخص پر یہ راز کھل جائے اس سے کارہائے عظیم دیکھنے میں آتے ہیں یہاں تک کہ ان کی صفت کرنا محال ہے۔“ (کیمیائے سعادت، ص ۸۱)

ایک خوش بخت ساعت تھی کہ یہ عاجز برزخ میں تھا۔ زمینوں اور آسمانوں کے درمیان رب العالمین کے عجائبات میں سے برزخ ایک ایسا مقام ہے جہاں ارواح قیام پذیر ہیں اور پروردگارِ عالم کے پسندیدہ اعمال کی انجام دہی میں مصروفِ عمل رہتی ہیں، بے شک اللہ ہی عزت عطا کرنے والا ہے۔ وہاں کے اہل اور بزرگ اپنائیت سے ملے اور محبت وشفقت کا اظہار فرمایا۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے بغل گیر ہوکر فرمایا......"یہاں آپ کے استقبال کی تیاریاں اتنی قابلِ رشک تھیں کہ ہم سب بہت مشتاق تھے۔" عرض کیا "یہ سب رضائے ربانی، عطائے محبوبِ سبحانیؓ، دعائے شیخِ محترم اور آپ بزرگوں کی شفقتوں کا صدقہ ہے۔" اتنے میں ایک انتہائی نورانی صورت بزرگ آگے تشریف لائے اور یوں ملے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ اُن کے ساتھ دو اور ہستیاں بھی تھیں۔ انھوں نے فرمایا......"میں حاجی احمد ہیلانی ہوں اور یہ آپ کے بابا جی حافظ خان محمد ہیں۔" میں نے جھک کر دست بوسی کی تو دوسرے بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ قاضی عبدالحلیم ہیں۔" عرض کی......"ان کا ذکرِ خیر تو اکثر خاندانی محفلوں کی زینت رہتا ہے اور سب آپؒ کا کلام سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔" تینوں ہستیوں نے شفقتیں نچھاور فرماتے ہوئے کچھ اور خاندانی بزرگوں سے بھی ملاقات کروائی۔ بابا جی خان محمدؒ نے نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا "بیٹے ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ جیسی اولاد سب کو عطا کرے۔" میں نے عقیدت ومسرت سے لبریز دل کے ساتھ "ما پروردۂ یک نو بہاریم" کہتے ہوئے تمام

بزرگوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہیلانی کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو حضرت حاجی احمدؒ نے فرمایا ...... "بیٹا ہیل عراق میں ایک قصبہ ہے وہاں ہمارے اجداد کا قیام رہا ہے اس نسبت سے ہیلانی ہوں۔"

دریں اثناء دیکھا کہ ہر طرف سے پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جارہی ہیں اور انوارات و ارواح مجھے دائرے میں لیے ہوئے ہیں، ایک اجتماع کا سماں تھا۔ میرے ہونٹ شوقِ اظہار میں لرزے اور کہا ...... "اس لطف و کرم کے لیے آپ حضرات کا شکر گزار ہوں۔" پھر فقیر نے ان بزرگان کو ڈیوٹیاں تفویض کیں اور ملتمس ہوا "ہم سب دربارِ اقدس ﷺ میں جوابدہ ہیں اور معاملات کی نوعیت و حساسیت آپ پر واضح ہے۔" سب نے اس منزل کے قبل از وقت سر ہو جانے کے حوالے سے تعاون کا یقین دلایا اور دُعاؤں سے نوازتے ہوئے حوصلہ افزائی فرمائی۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت جیؒ کی مشاورت سے حضرت جنید بغدادیؒ کو برزخ کمیٹی کی سربراہی سونپ دی گئی۔ انھوں نے وعدہ فرمایا........ "کام اگرچہ مشکل ہے مگر اللہ کے کرم سے بروقت مکمل ہو جائے گا۔" قاری کو جاننا چاہیے کہ دنیاوی امور اختیاری ہیں جبکہ برزخ کے ضروری، جن کی انجام دہی بہر صورت لازمی ہے اور ان کے حوالے سے تغافل نہیں برتا جاسکتا۔ فقیر نے ضروری کام سر انجام دیے تو آگے لے جایا گیا۔

یوں تو میرے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ ہر پل میرے رہبر اور بہر گام رہنما ہیں اور میری ظاہری و روحانی تربیت آپؒ ہی کے مرہونِ منت ہے مگر خاص طور پر برزخ میں اکثر بزرگوں سے تعارف انہی کے فیض و کرم کا نتیجہ تھا۔ آپؒ نے فرداً فرداً تمام ہستیوں سے ملاقات کا اہتمام فرمایا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ بہت سے روحانی ایک مقدس ہستی کے گرد جمع ہو کر ان کے فرمودات سنتے اور لکھتے جاتے ہیں۔ میں بھی

حضرت جیؒ کی معیت میں آگے بڑھا تا کہ ارشادات سے مستفید ہوسکوں۔ میرِ مجلس نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور مسکرا کر استقبال کیا۔ مسافر عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے عرض گزار ہوا "میں اپنی خوش بختی پہ نازاں ہوں کہ اللہ کریم نے مجھے راویوں کے امام اور اصحابِ صفہؓ کے جوہر کی زیارت کا موقع عطا کیا۔ اے حضرت ابو ہریرہؓ! مجھ عاجز کو بھی اس علم کی فہم کا کوئی نکتہ تعلیم کیجیے۔"

میری گزارش پر فرمایا "بے شک نسبت جوہر شناس ہوتی ہے۔ حضرت اویس قرنیؒ نے آپ کو عشق اور حضرت باغ حسین کمالؒ نے علم سے آراستہ کیا۔ عشق اور علم کا ملاپ ہی رسول ﷺ کی قربت کا ذریعہ ہے۔ مجھے اس ملاقات کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ الحمدللہ آپ نے عین معرفت سے مجھے پہچانا۔" پھر فرمایا ........ "عرب کے لوگ قبل از اسلام بھی لفظِ حدیث کو 'خبر دینا' کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور عربی کا محاورہ ہے صار حدیثا یعنی فلاں شے ضرب المثل ہوگئی۔ قرآنِ کریم کی سورۃ 'زمر' میں حدیث کا لفظ 'کلام' کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ (۲۳)

"اللہ نے بہترین کلام نازل کیا (یعنی) ایک کتاب جس کی آیتیں ملتی جلتی، بار بار دہرائی گئی ہیں۔"

یاد رکھیں کہ حدیث کی کئی اقسام ہیں جیسے موضوع، صحیح، حسن، ضعیف، مرفوع وغیرہ۔ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی شمالی عرب کے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور مکہ مکرمہ تو تجارتی مرکز تھا اس لیے وہاں مدینہ منورہ سے نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔ عرب کے باسیوں کو قرآنِ کریم میں اُمّی اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ سے دوری کے باعث کہا گیا۔ حضورؐ کو نبی الامّی اسی لیے فرمایا گیا کہ آپؐ ان اُمّیوں کے درمیان اُتارے گئے۔"

حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ بھی فرمایا ........ ''حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کا صحیفۂ صادق اور وہ جو میں نے حضرت ہمام بن مُنبہؒ کو نقل کروایا تھا اُمّتِ مسلمہ کی متاع ہیں۔''

میں نے عرض کیا ''حضرت ہمامؒ کے صحیفۂ صحیح میں بہت کم احادیث ہیں اور دریافت بھی بہت تاخیر سے ہوا، اس کی کیا وجوہات ہیں؟''

آپؓ نے فرمایا ''ایک تو ہمامؒ میرے پاس بہت دیر میں آئے۔ دوسرا یہ کہ ان کے نصیب میں اتنا ہی حصہ تھا جو بہر حال بہت بڑی نعمت ہے۔'' مزید فرمایا .....

''جمع حدیث کا کام رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں آغاز ہو گیا تھا اور میرے علاوہ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور دیگر کئی اصحاب نے صحت کے ساتھ حضورِ اقدسؐ کے ارشادات جمع کیے، یاد رکھے اور لوگوں تک پہنچائے۔''

اس کے بعد امام الرّاویان نے علمِ حدیث شریف کے کچھ خاص نکتے عطا فرمائے اور خصوصی دعاؤں کے موتیوں سے فقیر کا دامن بھرتے ہوئے وہ حدیثِ مبارکہ بطورِ خاص سنائی جس میں آئندہ زمانوں کے خوش بخت عشّاق نظر آتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ قَالَ: مِنْ اَشَدِّ اُمَّتِی لِیْ حُبًّا،
نَاسٌ یَکُوْنُوْنَ بَعْدِیْ، یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ رَآنِیْ
بِاَھْلِہٖ وَمَالِہٖ (مسندِ احمد، مسلم)

''نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا میری اُمت میں سے میرے ساتھ شدید محبت کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے اور اُن میں سے ہر ایک کی تمنا ہو گی کہ کاش وہ اپنے سب اہل و عیال اور مال و اسباب کے بدلے میں مجھے دیکھ لیں۔''

میں نے عرض کی ....... ''بے شک مُسلمان کا سب سے بڑا اور قیمتی اثاثہ عشقِ الٰہی اور حُبِ رسولؐ ہے۔'' نہایت شفقت سے فرمایا'' آپ کو اجازت ہے کہ جسے اہل جانیں اسے مخصوص احادیث کا اذن بطور وظیفہ دے سکتے ہیں۔'' فقیر نے اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے آگے روانہ ہوا۔

ضروری ہے کہ یہاں اپنے قاری کی معلومات کے لیے ایک دو باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ ایک تو یہ کہ اہلِ عرب ہر قول کو حدیث کہا کرتے تھے۔ لہٰذا آپؐ نے قرآنِ کریم کو، جو بے شک قدیم ہے، الگ سے بلند مرتبہ قرار دیا اور اپنے فرمودات کو لفظِ حدیث سے تعبیر کرنا پسند فرمایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ صحیفۂ ہمامؒ کی تلاش میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بڑی جانکاہی سے کام لیا اور اللہ کے فضل سے کامیاب ٹھہرے۔ مرحوم کو اس کے دو مخطوطے دمشق اور برلن سے ملے تھے اور دونوں میں سرِمُو فرق نہیں تھا۔ اس کو مزید سند اس وقت ملی جب دیکھا گیا کہ صحیفۂ مذکورہ کا تمام مواد مسندِ احمد میں موجود ہے اور کچھ احادیث امام بخاریؒ کی صحیح میں بھی شامل ہیں۔

یقیناً حضرت حمیدؒ اللہ کی محنت اور تلاش سراہے جانے کے لائق ہے لیکن اس خیال کی صحت سے اتفاق ممکن نہیں کہ یہ صحیفہ ۱۵۱ ہجری میں مرتب ہوا کیونکہ 'علوم الحدیث' کے مصنف ڈاکٹر صبحی صالح (لبنان) نے پوری ذمہ داری سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ہمامؒ ۱۳۱ ہجری میں واصلِ حق ہوئے جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات ۵۸ ہجری میں ہوئی۔ یوں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ مخطوطہ ۵۸ ہجری سے پہلے نقل ہوا جب حضرت ہمامؒ کی عمر مبارک پندرہ سولہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہوسکتا ہے انھوں نے بعد میں اضافے بھی کیے ہوں لیکن ۱۵۱ ہجری بہر حال درست نہیں۔ یاد رہے کہ حضرت ہمامؒ بن مُنبّہ ۴۰ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے بعد فقیر اُن اصحابِ کبارؓ اور تابعینؒ سے ملا جو حدیث و فقہ میں یکتائے روزگار ہیں اور ان میں سے ہر کوئی ایک الگ شان اور منفرد مقام کا حامل ہے، سب نے ہمت افزائی کی اور دُعا فرمائی۔ ایک ملاقات ایسی تھی جس کی یاد ہر آن مشامِ جاں کو مشکبو رکھتی ہے اور اُس کا نقش ابھی تک لوحِ دل پر ثبت ہے۔ لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ان سے رخصت لے کر آیا ہوں۔ اس دستِ شفقت کا لمس ابھی تک اپنے شانے پر محسوس ہوتا ہے، اللہ اسے دائم برقرار و قائم رکھے۔ یہ منظر امام الفقہاء حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات کا ہے۔ فقیر نے دیکھا کہ اہلِ برزخ ایک نورانی ہستی کے پاس آتے ہیں اور طرح طرح کے مسائل دریافت کرتے ہیں۔ کوئی فقہ سے متعلق مسئلہ پوچھتا ہے تو کوئی موضوع حدیثوں کے حوالے سے سوال کرتا ہے۔ حضرت جیؒ مجھے لے کر ان کی جانب بڑھے تو انھوں نے کھڑے ہو کر مجھ سے معانقہ فرمایا۔

حضرت جیؒ نے فرمایا "بیٹے آپ خوش بخت ہیں کہ امامِ اعظم حضرت نعمان بن ثابتؒ المعروف امام ابوحنیفہؒ سے شرفِ ملاقات حاصل کر رہے ہیں۔" میں تعظیماً جھکا تو انھوں نے نہایت شفقت سے اپنے پہلو میں بٹھانا چاہا۔ میں متردّد تھا کہ حضرت جیؒ بھی تشریف فرما ہوں تو بیٹھوں۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے فرمایا..... "کمال صاحب کو ایک کام کے سلسلے میں آگے جانا ہے اس لیے آپ تشریف رکھیں۔" میں حضرت جیؒ کی آنکھوں کا اشارہ پا کر بیٹھ گیا تو آپؒ کہیں تشریف لے گئے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا "بے شک آپؒ ہی کے لیے رسول کریمؐ کے روضہ اطہر سے "امام المسلمین" کی صدا آئی تھی۔ اے امام الفقہاء! مجھے بھی کچھ تعلیم فرمائیے۔" جواباً فرمایا.......
"بیٹے فہم اور فقہ میں فرق ہے۔ فہم صرف سمجھ ہے جب کہ فقہ کا مطلب ہے گہری فکر۔ ایسا تعقّل جو قول اور فعل کی گہرائی تک جا کر ان کا تجزیہ کرے اور یہ بہت مشکل رستہ

ہے.....ابو جعفر منصور نے بہت کوشش کی کہ مجھے قاضی بنائے۔ الحمدللہ میں نے تکیل پسند نہیں کی۔" عرض کی......"دورانِ اسیری حضرتؒ کے جسدِ پاک پر کوڑوں کے نشان بنانے والوں کو کہاں اندازہ تھا کہ آنے والی صدیاں فقہ حنفی کی روشنی سے منور ہوں گی۔" میں نے کنیّت کے بارے میں تصدیق کرنا چاہی تو بتایا...."اس کنیت کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو اپنی پیاری بیٹی کا اثر اور اس کی فرمائش جبکہ دوسری زیادہ اہم وجہ "دینِ حنیف" ہے کہ اللہ نے ہمیں یہ دین عنایت فرما کر اس کی حفاظت کا فرض سونپا۔" میں نے تائیداً عرض کی....."بے شک دینِ حنیف کا علمی وقار اور شان بڑھانے پر ابو حنیفہ کی کنیت آپؒ ہی کو زیب دیتی ہے۔ فقہ کے اصولوں کا تعین جس طرح آپؒ نے کیا یقیناً وہ سعادت کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔"

امامِ اعظمؒ نے فرمایا......"آپ کے نمازی متوسّلین کو مُبارک ہو کہ اتباعِ شریعہ کے باعث انھیں دولتِ عشق نصیب ہوتی ہے اور وہ سفلی مخلوقات سے محفوظ رہتے ہیں۔ میری طرف سے اسمِ ربّانی "القوی" کے وظیفے کا اِذن قبول کریں۔" اس کے بعد حضرتؒ نے اپنی نسبت عطا فرماتے ہوئے دعاؤں کے ساتھ اجازت دی کہ جب چاہوں ان سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ فقیر شکریہ کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ کا یہ قولِ معروف پڑھتا ہوا رخصت ہوا....."سب لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کے محتاج ہیں۔"

برزخ ارواح کی عارضی قیام گاہ ہے، یہ کوئی مستقل مقام نہیں۔ یہاں قیام پذیر ارواح انہی اعمال پر قائم ہیں جو وہ دنیا میں انجام دیتی رہیں یعنی مومن، یہاں بھی مومن ہے اور مشرک، زمین کی طرح یہاں بھی شرک پر قائم۔ برزخ اور آسمانوں میں قیام کے دوران رُوح پر گرانی کا احساس نہیں ہوتا، ایمان ہلکورے لیتا ہے اور اللہ کریم کی عظمت وجلالت ہر آن روح کو شادمان رکھتی ہے۔ یاد رہے کہ رُوح سبک ترین

ہے، وزن میں خوشبو سے بھی ہلکی لیکن مرتبے اور فضیلت میں انسانی فہم و ادراک سے ماورا۔ مادی اعتبار سے حیاتِ انسانی صرف 'جسم' سے عبارت ہے جس کی مشینری طبعی قوانین کے ماتحت سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اس کا رکنا موت کہلاتا ہے اور یوں ایک فرد حال سے ماضی کا قصہ بن جاتا ہے لیکن اسلامی تصورِ حیات کی رُو سے انسان "روح" اور "جسم" کا نادر امتزاج ہے۔ روح طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی۔ بالفرض اگر ان قوانین کے مطابق یہ مشینری حرکت کرنے کے قابل نہ رہے تو بھی رُوح پہ کچھ اثر نہیں پڑتا اور وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ رُوح جوہرِ اصلی، غیر فانی اور لازوال ہے جسے بالآخر اپنی حقیقت کی سمت جا کر اس کا جزو ہونا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں رُوح کُل میں سما کر سرشار ہو جاتی ہے۔ بقول غالب:

ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

گویا برزخ ایک ٹرانزٹ کیمپ (Transit Camp) ہے جہاں تمام ارواح اس امر کی منتظر ہیں کہ کب قیامت قائم ہو اور ان کا فیصلہ اعمال کی روشنی میں کیا جائے۔ بالکل ایسے ہی جیسے طالب علم امتحانات کے بعد اعلانِ نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ برزخ میں پاکیزہ روحوں کا انتظار خوف اور بے تابی کا باعث نہیں اور نہ ہی اُنہیں آئندہ کے حوالے سے کوئی خدشہ لاحق ہے۔ مذکورہ ارواح یہاں بھی حسبِ سابق انتہائی اطمینان اور سکون کے ساتھ عبادت و ریاضت اور مجاہدات میں مشغول ہیں جبکہ گناہگار یہاں وحشت، خوف اور اندیشوں میں مبتلا ہیں اور انھیں عذاب کا سامنا ہے۔ اگرچہ یہ ایذا دوزخ کی اذیت سے بہت کم درجہ ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ نُور اور نار کے اسرار اس مقام پر سالک کو دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف ذکر و فکر کی ترتیب ہے تو دوسری جانب غم و آلام کا سلسلہ۔

برزخ کی زندگی ہماری دنیاوی زندگی سے یکسر مختلف ہے۔ عالمِ ارض سے برزخ میں آنے والی ارواح جسمانی آلائشوں سے نکل کر ایسے جہان میں داخل ہو جاتی ہیں جہاں جسد وخاک کا گزر نہیں۔ یہاں روحانی سطح پر زندگی سے معاملہ ہوتا ہے اور سالک بالیدگیٔ نفس کے نمونے دیکھتا ہے۔ ارواح کی اصل یعنی ان کی دنیاوی پہچان صرف اولیاء ہی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک برزخ میں صرف انہی روحوں کا قیام ہے جو دنیا سے موت کے بعد منتقل ہوئیں حالانکہ ایسا نہیں، برزخ میں دیگر مخلوقات اور اقوام بھی مکیں ہیں جو اہلِ آخرت میں سے ہیں۔ ایمان وایقان کا حامل ہی ان سے اُنس رکھتا ہے اور وہ بھی فوراً اس کی جانب ملتفت ہوتے، عبادات میں اس کی ہمت بندھاتے، خالقِ کائنات کی شان بیان کرتے اور حُبِ اللہ کی لَو بڑھاتے ہیں۔ ان کی محفل بہت پر کیف اور عنایاتِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے۔ وہ ایک عاصی کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتے۔ سیاہ کار کے ساتھ معاملہ کرنے والے ایسی مکروہ صورتوں میں ہوتے ہیں گویا گناہ مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔ وہ خطا کاروں کی طرف بری صورت لے کر جاتے ہیں اور انھیں اُن کرتوتوں کی یاد دلاتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔

فقیر کو بتایا گیا کہ یومِ حساب کے بعد جب سب کی فردیں ان کے حوالے کر دی جائیں گی تو یہ عالم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے گا۔ مومن جنت میں مستقلاً ان مقامات پر فائز ہو جائیں گے جو اللہ کے فضل وکرم سے ان کے لیے مخصوص کر دیئے گئے ہیں اور اہلِ دوزخ دائم ان عذابوں میں گھرے رہیں گے جو اعمالِ قبیحہ کی وجہ سے ان پر مسلط ہوں گے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ سے اجازت لے کر رخصت ہوا تو دیکھا کہ ایک طرف سے قال رسولؐ کی مبارک صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک بزرگ نُوری حصار میں گھرے کچھ بیان فرما رہے تھے اور لوگ، سُبحان اللہ، لبیک یا رسول اللہؐ، احسنت مرحبا

جیسے کلمات جواب میں بلند کرتے تھے۔ فقیر بھی ایک صاحب کی اجازت سے اس مجمع میں بیٹھنے لگا تو خطیب نے اشارے سے آگے بلا لیا اور پہلو میں بیٹھنے کے لیے انگشتِ مبارک ہلائی۔ میں نے تعمیل کی تو انھوں نے گفتگو آگے بڑھائی۔ یوں کافی دیر گزر گئی۔ محفل برخاست ہونے پر سب رخصت ہوئے تو میں نے عرض کی.........

"بے شک دنیا کو فنا ہے اور ہمارے مستقل قیام کا فیصلہ یومِ حساب میں ہوگا۔ ہر شے کو اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے۔

بای خدیک تبدی البلا وبای عینک ماذا السلا

"کون سا چہرہ ہے جو مٹی میں نہیں ملا اور کون سی آنکھ ہے جو بہہ کر زمین پر نہیں ٹپکی۔"

......ہم نے آپؒ کا زمانہ نہیں پایا لیکن یہ اللہ کا فضل ہے کہ اب آپؒ کی زیارت ہوگئی۔ میں اپنے شیخؒ کے اس ارشاد پر دل وجان سے یقین رکھتا ہوں کہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بخاریؒ امام الآئمہ فی الحدیث ہیں اور محدّثین کے لیے آفتابِ ہدایت۔ آپؒ کے علم ومعرفت نے عشق واحتیاط کا حسین امتزاج پیش کیا۔ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ یہ سب برکت آپؒ کی کنیّت ابوعبداللہ کی وجہ سے ہے۔" میری بات سماعت فرما کر امام بخاریؒ مسکرائے اور فرمایا.... "بیٹے عشق وہ نکتے بھی سُجھا دیتا ہے جو ساری عمر مخفی رہتے ہیں۔ یہ نکتہ آفرینی مبارک ہو۔ اس بات کی خوشی ہے کہ اللہ نے یہ نام ذہن میں ڈال دیا اور میری اولاد کو بھی نبیٔ کریمؐ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہؓ کے اسمِ پاک سے سربلند کیا....... آپ سے ملاقات یوں بھی باعثِ فرحت ہے کہ عشق بہرحال افضل ومحترم ہے۔" پھر دریافت فرمایا "حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کی 'فتح الباری' نظر سے گزری ہے۔" عرض کی "حضرت یہ عاجز زبانوں کی معرفت میں ایک طالب سے زیادہ درجہ نہیں رکھتا البتہ حافظؒ کی شرح ہی وجہِ شوق بنی اور اسی سے میں نے جانا کہ فقہ میں بھی آپؒ کا مقام بہت بلند ہے۔"

غرض امام بخاریؒ نے بہت سے انعامات سے نوازا اور حدیث شریف "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات" کا وظیفہ بھی اجازت کے ساتھ عنایت کیا۔ راقم اسے اپنی سرفرازی خیال کرتا ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث نے میری درخواست پر عالمِ اسلام اور خصوصاً پاکستانی علمائے کرام کے لیے دُعا فرمائی اور میرے مشن کے حوالے سے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے فرمایا کہ جب چاہوں رابطہ کر لوں۔ پھر خاص طور پر تاکید فرمائی..... "اگر آپ کے کسی متوسّل کو طلبِ حدیث کا شوق ہو تو ان احادیث کا خیال رکھے جو فقہا، علمائے اصول، علمائے نحو، محدثین اور عوام میں معروف ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو بیک وقت مشہور ہیں۔" بعد میں ان ارشادات کو میں نے مختلف کُتب میں مرقوم پایا تو کلماتِ شکر ادا کیے۔ ڈاکٹر صبحی صالح نے ان احادیث کے متعلق یوں لکھا ہے:

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق یعنی فقہا میں مشہور۔
رفع عن امتی الخطاو النسیان و ما استکر ھو علیہ، اصولی علماء میں معروف۔
من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، بیک وقت علمائے محدثین اور عوام میں مشہور۔
نعم العبد صھیب، عوام میں مقبول۔

قرآنِ کریم کی آیات پر غور و تفکر کیا جائے تو عیاں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو واضح طور پر دو طبقوں میں دیکھ کر اُنھیں اہلِ ایمان اور منکرین کا نام دیا۔ ایک وہ ہیں جو سب کچھ دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے باوجود "میں نہ مانوں" کی روش پر قائم ہیں۔ ان کے دلوں، آنکھوں اور کانوں پر مہریں ثبت ہیں اور کوئی دلیل ان کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ یہ لوگ اس کائنات کی تخلیق و تشکیل کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہیں اور خدا کی نشانیوں سے اس کے ہونے کی گواہی نہیں لیتے یہاں تک کہ انبیاء و رُسل کے انکاری ہیں۔ قرآنِ کریم انھیں ظالم، فسادی، منکر، مشرک اور کافر قرار دیتا ہے۔ یہی لوگ فساد فی الارض کا باعث بنتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کے بدلے میں انھیں

ایک روز اس عذاب کا سامنا ہوگا جو دنیا کے عذاب سے بہت بڑا، سخت کڑا اور نا مختتم ہے۔ غافلین کو ’سورۃ ق‘ میں خبردار کیا گیا ہے کہ جب قیامت کے دن ان کی آنکھوں سے پردے ہٹیں گے تو عذاب ان کے لیے تیار ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○ (ق۔۲۲)

”اب ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔“

یعنی اب غفلت کا نتیجہ بھگت اور نہ ماننے والے دل اور آنکھوں کو رو۔ راقم نے برزخ میں ایسے گروہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو وہاں پچھتاوے میں بری طرح مبتلا اور خوفزدہ ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی طبقے کو مخاطب کیا گیا ہے۔

دوسرے وہ اہلِ ایمان ہیں جن کا ہر قول و فعل صرف اور صرف خوشنودیٔ باری تعالیٰ کے تابع ہوتا ہے اور بہر گام رضائے الٰہی اُن کی ترجیحِ اول رہتی ہے۔ اُم الکتاب میں ان کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال۔۲)

”ایمان والے لوگ دراصل وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل کانپ جائیں۔“

وہ ہر عمل اس کی خوشی کے لیے سرانجام دیتے ہیں اور اس حقیقت پر کامل ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ذاتِ واحد خلوت و جلوت میں ہمیں دیکھ رہی ہے۔ انھیں اللہ کے سوا کسی کی حاجت نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی ذات ان کے خیال و خواب میں ہے جو اُن کی مطلب برآری پر قادر ہو۔ ان کی روزمرہ زندگی اور شب و روز کا ہر عمل عین عبادت کے زمرے میں داخل ہے۔ وہ محبوب کو روشنی کا سفیر مانتے ہوئے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جہاں اس کا ٹھکانہ ہو وہاں چراغ کی حاجت نہیں رہتی۔ ایسے لوگ بے شک کامیاب و کامگار ہیں اور اُسی رُخ سے نور کشید کرتے ہیں جس کی قیام گاہ صرف مومن کا

دل ہے۔ ایسا دل جو نور اللہ سے تابندہ رہتا ہے اور ضیائے محمدیؐ سے اُجالے کشید کرتا ہے۔ یوں جب ایک مومن کے نہاں خانۂ دل سے غیر کا پرتو تک مٹ جاتا ہے تو اسے حجابات اٹھتے محسوس ہوتے ہیں اور چہار سُو 'اللہ ہی اللہ' کا ظہور دعوتِ نظارہ دینے لگتا ہے۔

یاد رہے کہ تصوف کی بنیاد استدلالی فکر نہیں، روحانی فکر ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ریاضی کے کتنے سوالات اور معمے ہیں جنہیں ہر شخص حل نہیں کر سکتا۔ بس کچھ لوگ ہیں جنہیں یہ علم ودیعت ہوا ہے اور وہ صحیح جوابات تک رسائی رکھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اور انھیں حل نہ کر سکے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان سوالات کی بنیاد ہی غلط ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی کے لیے ریاضیاتی اور سائنسی استدلال ہرگز کام نہیں آ سکتا کیونکہ یہ استدلال صرف معلوم پر قائم ہے اور تمام موجود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ایسا قطعاً نہیں کہ سارا موجود ریاضی اور سائنس کا معلوم ہو۔ ہم آئے دن نئی نئی دریافتوں اور ایجادات کے بارے میں سنتے ہیں اور زندگی میں ان کا تجربہ کرتے ہیں جو ہمارے لیے محض ہماری لاعلمی کے باعث پہلے موجود نہیں ہوتیں۔ کچھ دہائیاں قبل سائنسدانوں نے بگ بینگ (Big Bang) اور بلیک ہول (Black Hole) کا تصور دیا اور یہ کام بھی ابھی نظری سطح، تضاداتی تھیوری اور قیاسی فلسفہ پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجود آہستہ آہستہ علم کے ذریعے معلوم بن رہا ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل سائنس دان اپنی معلوم کہکشاں (Milky Way) کو ہی کل کائنات سمجھتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ رہی ہے کہ اس وقت کائنات اربوں پختہ (Mature) کہکشاؤں کے ایک مربوط اور پائیدار نظام پر مشتمل ہے اور بے شمار دیگر کہکشائیں ابھی تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔ کائنات میں کہکشاؤں کی مختلف اقسام، عمریں اور ان کے اَدوار اس بات کی دلیل ہیں کہ کائنات

ابھی نامکمل ہے اور شاید ہمیشہ ارتقاء پذیر ہی رہے گی، نئی کہکشائیں وجود میں آتی رہیں گی اوران میں نئے سورج اُگتے رہیں گے۔ بقول اقبالؒ:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

ایک سچے صوفی کے نزدیک علم کی انتہا ذاتِ باری سے ہمکناری ہے۔ روحانی استدلال اپنی اساس میں زیادہ عقلی ہے اور تجربے کی اس سطح تک لے جاتا ہے جہاں غیر اور ماسوا کا تصور ہی نہیں۔ یہ ریزگی کا شکار اور ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں بلکہ حقیقتِ کاملہ کا مکمل اور کلی تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس محض استدلال کی بنیاد پر استوار فکر سے آوارگی اور شکستگی آشکار ہوتی ہے۔

تصوف نباتات، حیوانات، جمادات اور دیگر انواع کو الگ سمجھنے کے باوجود ان کے مرکز تک پہنچتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام مظاہر اور مخلوقات ایک ہی کل کا پرتو ہیں مگر یوں کہ ان کی تقسیم سے کل کی حقیقت وحیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب تو ایٹمی توانائی کی تقسیم در تقسیم نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ ذرّہ چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اتنی ہی توانائی رکھتا ہے جتنی تقسیم ہونے سے قبل اس میں تھی لیکن اس عقدہ کشائی کے باوجود عقلیت پسند، جوہر کی بنیاد تک رسائی سے محروم ہیں۔

رُوحانی یا صوفیانہ استدلال پوری سلامت روی کے ساتھ حقیقت کا وہ تصور پیش کرتا ہے جسے عشق کے علاوہ کسی لیبارٹری تجزیے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بھید صرف اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دینے والے پر ہی کھلتا ہے کہ باطنی پاکیزگی اور تطہیرِ ذات کس جوہر کا نام ہے اور حقیقتِ اعلیٰ سے دراصل کیا مراد ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو ساری عمر محض عقلی علوم کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں اور اس تعاقب کے آخر میں

انھیں معلوم ہوتا ہے کہ سراب دُور ہی سے پانی نظر آتا ہے۔ بھلا ایسے لوگ کیا جانیں کہ زمین و آسمان میں وقت کن روشوں پر چلتا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ جب محبوب اور محب ملتے ہیں تو وقت کہیں دور اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ بقول حضرت جیؒ:

دور پیچھے رہ گئی تھی وقت کی رفتار بھی

میں مکاں کو چھوڑ کر جب لامکاں کو چل پڑا

وصال کا عمل ایسا ہے کہ زمان و مکاں کی قید باقی نہیں رہتی، من و تُو کا فرق تمام اور عکس و آئینہ کی دُوئی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ وصال ہے اتصال نہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ کچھ عرصہ قبل اسلام آباد سے ایک یونیورسٹی کے چند طلبا و طالبات میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم وقت کی تھیوری سمجھنا چاہتے ہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے مُسلم اور غیر مُسلم مفکرین اور دانشوروں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ان کے نظریات سے ہماری تشفّی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو نمازِ عصر ادا کر لیں تا کہ فرض کی ادائیگی کے بعد اطمینان سے بات ہو سکے۔ طالبات کے لیے پردے میں نماز پڑھنے کا اہتمام کیا گیا۔ نماز کے بعد اُن سے پوچھا........ ”کیا آپ کسی ایسی ہستی کے متعلق بتا سکتے ہیں جو ہر جگہ موجود ہو۔“ کہنے لگے ”یقیناً اللہ ہر جا ہے۔“ میں نے سوال کیا..... ”اس وقت یہاں پیر ودھائی میں سوا چار بجے ہیں (یہ ملاقات پیر ودھائی، راولپنڈی میں ہوئی تھی) جبکہ برطانیہ میں دن بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ کیا اللہ تعالیٰ وہاں بھی موجود نہیں۔“ اس پر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے کہا..... ”اللہ تعالیٰ وہاں بھی ہے جہاں مہینوں تک رات ڈیرے ڈالے رہتی ہے اور وہاں بھی جہاں دن

طویل ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ انسانوں کے بنائے ہوئے تصورِ وقت سے بے نیاز ہے جبکہ ہم نہیں۔" کہنے لگے "بے شک۔" پھران سے دریافت کیا..... "یہ ایک بجے، چار بجے، بارہ بجے کیا ہے۔ وقت کی یہ تقسیم کس نے کی ہے؟" کہنے لگے "انسانوں نے۔" میں نے کہا..... "بالکل ٹھیک۔ وقت کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں تو حضرتِ انسان نے اپنی آسانی کے لیے تقسیم کر رکھا ہے ورنہ یہ زماں بجائے خود ایک دریائے بے کراں کی مانند رواں دواں ہے..... بھلا اللہ انسانوں کے مرتب کردہ پروگرام پر کیوں چلے گا! وہ تو زمان و مکاں سے ماورا ہے۔

لیس عند اللہ صباح والامساء (اللہ تعالیٰ کے نزدیک صبح و شام نہیں)

........اس نے ہمارے لیے شب و روز اس لیے بنائے کہ ہم سہولت سے رہیں اور اوقاتِ کار کی تقسیم کر لیں۔ جن علاقوں میں مہینوں پر مبنی دن رات ہوتے ہیں دنیاوی اعتبار سے تو وہاں کے باشندوں کی عمریں بمشکل چند سال ہوں گی۔ تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت ادریسؑ کی عمریں اس لیے دراز تھیں کہ ان کے زمانے میں دن رات چھوٹے تھے۔" بچوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ بے شک وقت کا جبر انسان کا اپنا مسلّط کردہ ہے۔ فقیر نے سورۂ دہر کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ زمانے سے کیا مراد ہے اور وقت کیا ہے۔ یہ بھی عرض کیا کہ ذاتِ قدیم پر وقت اثر انداز نہیں ہوتا۔ اگر آپ زمین کے مدار سے باہر نکلیں تو پھر حقیقت کی خبر ملے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ سب میری اولاد کی مانند ہیں، علم حاصل کریں، ملک و قوم کی خدمت کریں، احکامِ دین پر عمل پیرا ہوں مگر ذاتِ حقیقی کو سمجھنے کے لیے وہی Methodology اختیار کریں جو منزل پر پہنچائے یعنی "عشقِ حقیقی"۔

غرض بچے مطمئن گئے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ تلاوتِ قرآنِ کریم، پابندیٔ ارکانِ اسلام، ذکرِ الٰہی اور درود شریف کو اپنائیں گے اور

اپنے سینوں میں علم کے ساتھ ساتھ عشق اور محبت کی شمع بھی فروزاں رکھیں گے۔ میری قوم کا سرمایہ وہ نوجوان جہاں رہیں خوش رہیں اور اللہ انھیں اپنے وعدے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دراصل تصوف ماہیتِ عالم کو مناسب ترین زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی ریاضت کا نام ہے۔ شیخِ کامل، منظر تبدیل نہیں کرتا بلکہ زاویۂ نظر بدل کر اشیاء و مظاہر کو حقیقی رنگ میں دیکھنے کا وصف پیدا کرتا ہے، یہاں تک کہ حجابات اٹھتے چلے جاتے ہیں اور سالک ہر آن وصلِ یار سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خرد پرست کج فکری کے باعث حقیقتِ عظمیٰ کے فہم وادراک سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے نگاہ اور زاویۂ نگاہ کی حفاظت سالک کی اولین ذمہ داری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصطلاحوں کے بنیادی نکات کو سمجھے اور اپنی منزل کے مطابق عمل کرے۔ بلقیس کا تخت لانے والے (آصف بن برخیا) کے لیے وقت کا مفہوم بالکل جدا ہے۔ اسی طرح تصوف میں حجابات کا اٹھنا وقت کو قطع کرنے کے مترادف ہے۔ بہت کم لوگ "الوقت السیف" کی معنویت کو سمجھتے ہیں۔ وقت قاطع ہے، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ لوگ حسبِ توفیق اس کے مدار سے نکلتے اور اس میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی سالک اپنے شیخ کے پاس اس نیت سے بیٹھے کہ ایک آدھ گھنٹے میں فیض پالے گا تو گویا وہ Stopwatch کے اصول پر عمل پیرا ہے۔ اگر شیخ آپ کو پلک جھپکنے میں حرم شریف اور دربارِ رسالت ﷺ میں باریاب کروا کر واپس لے آئے اور گھڑی ابھی چار ہی بجا رہی ہو جبکہ آپ 3:55 پر آئے ہوں تو اسے کیا نام دیں گے۔

ایک کامل شیخ کی نگاہ پاتال سے برزخ اور اس سے بھی اوپر لا اور لے جاسکتی ہے، یہ ہے شیخ پر ایمان کا ادنیٰ درجہ اور مدارجِ تصوف کی ابتدا۔ اس لیے قارئین نے کبھی بھی صوفیاء اور اہل اللہ کو انسانی گھڑی اور زمانی معیارات کے مطابق وقت پر گفتگو

کرتے نہ سنا ہوگا۔ خود میں نے اپنے شیخِ مکرّم کو کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے روحانی منازل یا نکاتِ معرفت کے بیان میں فرمایا ہو کہ جب میں دربارِ اقدس ﷺ میں باریاب ہوا تو پانچ بجے تھے۔ زیادہ سے زیادہ پہروں کا بیان ہے اور وہ بھی صلوٰۃ و اقامت کے ضمن میں۔ سالک کا رُتبہ یہ ہے کہ مرشد کی نگاہِ بلند اسے ان مقامات پر پہنچاتی اور ان درجات پر فائز کرتی ہے جو بارگاہِ عشق سے تعلق رکھتے ہیں اور جہاں عقل و خرد کی رسائی نہیں۔ یہ پاکیزگیٔ قلب کا کرشمہ ہے جو صرف اور صرف اللہ کے کرم اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے نصیب ہوتی ہے۔ مرشد کی نظر ہو تو مرید کا سفر صدیوں کی بجائے گھڑیوں میں طے ہو جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ مرتبۂ عشق، اطاعت اور عاجزی کی عطا ہے۔ یہاں اطاعت سے مراد محض ہاتھ چومنا یا پاؤں دابنا نہیں بلکہ حصولِ عشق و محبت کی بھرپور جستجو ہے۔ جب سالک اپنا آپ شیخ کو سونپ دیتا ہے تو اس پر اختیار کے در وا ہو جاتے ہیں۔ فقیر نے یہ وضاحت اس لیے ضروری سمجھی کہ صاحبانِ ذوق مہمیز پا کر آگے بڑھیں اور وقت کی غلط اور غیر ضروری بحثوں میں نہ پڑیں۔ واقعۂ معراج پر گواہی دینے والے کا شرف ہی یہ ہے کہ اسے خواہ مخواہ کے الجھاوے درپیش نہیں ہوتے۔

انہی الجھاووں میں ایک نظریۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی دیرینہ، پیچیدہ اور نازک بحث بھی ہے۔ یہ دونوں نظریات دراصل ہمہ اُوست 'سب کچھ وہی ہے' اور ہمہ از اُوست ''سب کچھ اُسی سے ہے'' کی تشریحات ہیں۔ ایک جماعت اللہ کو لاشریک مان کر بھی شرکت پر مُصر ہے اور دوسرا گروہ اُسے وجودِ مطلق جان کر بھی مظاہر میں تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ربِّ کائنات ذاتِ واحد ہے اور کوئی بھی مظہر اُس کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔ گویا وہ قدیم و جاوداں ہے اور کائنات حادث و فانی۔ ''سب کچھ وہی ہے'' کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ سارے کا سارا

کہیں سما گیا ہے اور ''سب کچھ اُسی سے ہے'' کا مفہوم بھی یہ نہیں کہ مظاہر اُس کی مکمل نشاندہی کرتے ہیں۔ انسان زمین پر اُس کا نائب اور خلیفہ ہے لیکن اُس کے وجود کا حصہ دار نہیں، گویا حادث کبھی قدیم کی جگہ نہیں لے سکتا۔ تمام مظاہر اُسی کی صفاتِ عالیہ کا مظہر ہیں۔ تمام وجود اُسی کے حکم پر قائم ہوئے اور اُسی کے تابع ہیں۔ بیشک اُس نے اپنی بعض صفات انسان و مظاہر میں رکھ دیں اور نبی کریمؐ کو سب سے زیادہ صفاتِ عالیہ سے آراستہ فرمایا۔ فقیر پر یہ حقیقت القاء کی گئی کہ مذکورہ تصورات دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں جن کی روح یہ ہے کہ باری تعالیٰ اپنی ذات میں وجود ہے اور صفات میں شہود۔ گویا سبھی مظاہر اور اشیاء ایک ہی سچائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ اس اختلافِ لفظی کو ہوا نہیں دینی چاہیے کیونکہ حقیقت تک رسائی کے منطقے مختلف سہی مگر اُن کی اصل ایک ہے۔

یکیست معنیٰ اگر لفظ بے شمار بُود
یکیست یوسف اگر صد ہزار پیرہن است

(بہت سے الفاظ مل کر ایک معنیٰ کو ترتیب دیتے ہیں اور پیرہن الگ الگ
ہوتے ہوئے بھی ایک یوسف کی نمائندگی کرتے ہیں۔)

ایک مقام پر حضرت بایزید بسطامیؒ کو انواراتِ توحید میں گھرا دیکھا تو مجھے 'تذکرۃ الاولیاء' میں شامل حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول یاد آ گیا:

''بایزید بسطامیؒ ہم لوگوں میں ایسے ہیں جیسے ملائکہ میں جبرئیلؑ۔''

بے شک آپؒ کے اوصاف اولیائے کرامؒ کا زیور ہیں لیکن عشقِ توحید وہ نعمت ہے جو حضرتِ موصوف کے خاص مراتب میں سے ایک ہے۔ مجھے دیکھتے ہی دعاؤں سے نوازتے ہوئے سلام کیا۔ میں نے تعظیم کے ساتھ جواب دیا تو فرمایا.....

"تابش بیٹے، میں کافی دیر سے آپ کا منتظر تھا۔آئیں اپنی امانت لے لیں تاکہ میں سُرخرو ہوسکوں۔" یہ کہہ کر آپؒ نے عقیق سے مزین ایک تسبیح میرے سپرد کی۔ میں نے ممنونیت کا اظہار کیا تو فرمایا ....... "یہ تسبیح حضرت الیاسؑ سے ہوتی ہوئی مجھ تک آئی ہے،حکمِ رسالت مآب ﷺ کی تعمیل میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔"

میں نے رِقت کے ساتھ اللہ اکبر اور الحمد للہ کا ورد کیا جس میں حضرت بایزیدؒ بھی شریک ہو گئے۔عرض گزار ہوا .... "حضرت آپؒ ان ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے دین کی پیروی کا عملی نمونہ فراہم کیا۔ بے شک سورہ لقمان آپؒ کی زندگی میں انقلاب کا باعث بنی، میرے لیے کوئی نصیحت؟" یہ سن کر میرے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا ..... "آپ کو سونپی گئی ذمّہ داری کے حوالے سے کافی کام تو سرانجام پاچکا ہے لیکن حضراتِ برزخ میں سے چند مزید حضرات کو بھی کچھ ذمہ داریاں تفویض کر دی گئی ہیں تاکہ کام تیزی سے ہوسکے۔" میں نے شکریہ ادا کیا اور آگے روانہ ہوا۔

برزخ عجیب وغریب مقامات کا حامل ہے۔وہاں بعض اللہ والے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے عام لوگ نسبتاً کم شناسا ہیں لیکن وہ ایسے درجات پر فائز ہیں کہ رشک آتا ہے، مثلاً حضرت فضیل بن عیاضؒ۔راقم نے دیکھا کہ عبادت میں اس طرح محو تھے کہ خشوع وخضوع کے باعث ان کا پورا بدن بانس کی طرح کانپتا اور سرو کی طرح ڈولتا تھا۔فراغت کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے تو عرض کی...... "یقیناً آپؒ کو اللہ کے خزانوں میں سے بہت کچھ عطا ہوا ،کیا یہ لٹیروں کے قافلے سے الگ ہونے کا ثمر ہے؟" یہ سن کر مسکرائے اور مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے"ہم جیسے بس اتنا ہی بلند ہوسکتے ہیں کہ اللہ کے کرم سے ڈاکا چھوڑ کر راہِ راست پر آجائیں۔ یہ تو ابنِ کمال کا نصیب ہے کہ باری تعالیٰ نہ صرف اسے پسند فرماتا ہے بلکہ اس کے بدن پر اپنے نام کی مہر بھی ظاہر

کرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے حضرتؒ نے اس عاجز کا دایاں ہاتھ فرطِ جذبات سے چوم لیا، پھر نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے .... "میری زندگی تو سورۃ الحدید کی آیت

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُھُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ

"کیا مومنوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے نرم ہو جائیں"

نے بدل کر رکھ دی۔" عرض کیا ..... "حضرت کیا یہ درجہ کم ہے کہ اللہ نے آپؒ کو اپنے مقبول بندوں میں شمار کیا اور مخصوص مقامات عطا فرمائے۔" میری بات سن کر حضرت فضیلؒ طویل سجدے میں چلے گئے۔ میں یہ کیفیت ملاحظہ کر کے سبحان اللہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

اس کے بعد جس ہستی سے ملاقات ہوئی ان کا شمار اعتقاد اور اقتدا کے لائق بزرگوں میں ہوتا ہے اور وہ علمی اعتبار سے بلاشبہ اہلِ تصوف کے محسن ہیں۔ حضرت حارثؒ حالتِ مراقبہ میں سانس روکے تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا تو آنکھیں کھولیں اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ مجھے کچھ یاد آیا اور عرض کیا..... "جنابؒ تو اپنے والد کے ترکے سے دستبردار ہو گئے تھے۔" میری بات سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا" نبی کریمؐ کے ارشادِ پاک کی روشنی میں کہ دو مختلف مذاہب کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، اپنے مجوسی المذہب والد کے ترکے سے کچھ نہیں لیا۔" میں نے کہا ..... "صرف ترکے سے دستبرداری اتنا مقام نہیں دلا سکتی، کیا آپؒ جانتے ہیں کہ یہ مرتبۂ بلند کیسے نصیب ہوا؟" فرمایا ..... "یہ تو معلوم نہیں لیکن ایک بات کا بخوبی علم ہے کہ تنہائی میں اللہ کا ذکر زیادہ نفع دیتا ہے اور نفس کا محاسبہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے"۔ میں نے کہا ......... "اسی لیے تو آپؒ آج بھی محاسبیؒ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔" پھر آپؒ نے اپنی کتاب 'الرعایہ' سے کچھ خاص باتیں تعلیم فرمائیں اور میرے

ماتھے پہ بوسہ دے کر دعا کے لیے کہا۔ راہی بارگاہِ تعالیٰ میں عرض گزار ہوا "اے اللہ! انھیں اپنے مخصوص بندوں میں شامل فرما۔" حضرت محاسبیؒ نے مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے دعاؤں سے نوازا تو راقم اگلی منزل کے لیے روانہ ہوا۔

یہاں یہ بتا تا چلوں کہ اگرچہ آپؒ علومِ ظاہری و باطنی میں قبولِ عام کے درجے پر فائز تھے لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت حارثؒ کے درس پر پابندی عائد کرادی تھی اور وہ کچھ عرصہ جلاوطن بھی رہے تھے۔ فقہا نے حضرت محاسبیؒ پر بہت اعتراضات کیے لیکن آپؒ گوشہ نشیں ہو کر طہارتِ نفس میں مصروف رہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ امام غزالیؒ پر بھی آپؒ کے بے پناہ اثرات ہیں۔ فقیر کا خیال ہے کہ صوفیاء پر فقہا کے اعتراضات ان کی ظاہر پرستی کے سبب ہیں ورنہ اگر انھیں اہل اللہ کی رُوحانی و قلبی معرفت کا اندازہ ہو جائے تو اپنی آراء سے یقیناً رجوع کریں۔ فقیر نے حضرت حارثؒ کو قرآن و حدیث اور تصوف پر ایسی گفتگو کرتے سُنا جو اہلِ ایمان کے لیے رُوح پرور ہے۔ آپؒ نے فروعی اور غیر ضروری بحثوں کی مذمّت کی اور بتایا کہ کیسے قرآن نے اہل اللہ کی پوری کیفیت کو کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یقیناً ہمارے لیے قرآن و حدیث ہی دلائل کا سب سے بڑا خزانہ ہے جس کا حرف حرف ہر قسم کے شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ اگر اس سے رشتہ استوار کر لیا جائے تو کوئی مشکل درپیش نہیں ہوتی۔ سورہ ق (۳۷) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ۝

"بے شک قرآن میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو دل رکھتا ہو اور پوری توجہ سے کان لگا کر اللہ کے احکامات سنتا ہو۔"

اسی طرح سورۃ الزمر (۱۸) میں ارشادِ پاک ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَاُولٰٓئِکَ ھُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ○

"(اے محمد ﷺ، میرے ان بندوں کو خوشخبری دیجیے) جو (قرآن کی) باتوں کو غور سے سُنتے ہیں پھر اس پر اچھی طرح عمل کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور یہی ہیں جو عقل اور فہم رکھتے ہیں۔"

تصوف کے نام پر لکھی گئی بعض کتب میں اولیاء کے فقہی نظریات وخیالات کے حوالے سے بحث چھیڑی جاتی ہے۔ تصوف تو سراسر عشق ہے جو تمام فقہوں کا احترام سکھاتا اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ اس کے اسرار سے واقفیت کی لذت جادۂ عشق پہ گامزن مسافر ہی کا مقدر ہوسکتی ہے۔ ایک عارف کا حال کوئی عارف ہی جان سکتا ہے۔ ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ شبلیؒ اور منصور کے ایک دوسرے کے بارے میں کیا تاثرات تھے یا حضرت جنیدؒ، منصور کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ عین ممکن ہے کچھ لوگ راقم کی طرح ازخود رفتگی کو مسافت عشق میں کوتاہی اور زیاں کا سبب جانتے ہوں لیکن اپنے نظریات دوسروں پر تھوپنے سے گریز ہی مستحسن ہے۔

فقیر شیخ القرآن، شیخ الحدیث اور سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے بھی ملا۔ ان کی صحبت روح کو بالیدگی اور قلب کو تازگی عطا کرتی ہے۔ فقیر نے انھیں حضرت محاسبیؒ کی طرح مہکتا ہوا پایا۔ سلام کے بعد عرض کیا "حضرت آپؒ نے اپنے دور میں تصوف کو اہلِ ظاہر کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو خدمات سرانجام دیں وہ اہلِ علم اور اہلِ عشق سے کسی طور پوشیدہ نہیں۔ کتنی خوش بختی ہے کہ آپؒ کے ماموں اور مرشد حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا...... "کبھی مرید مرشد سے بھی بلند ہوجاتا ہے اور میرا

جنیداس نکتے کی عملی تفسیر ہے۔" آپؒ نے گلے لگاتے ہوئے فرمایا...... "وہ بیٹا بھی تو خوش نصیب ہے جس کا باپ اس کا شیخ ہواور فرمائے کہ میں تابش صاحب کا باپ اور شیخ ہونے پر فخر کرتا ہوں۔" میں نے کہا...... "میرے لیے باعثِ اعزاز ہے کہ میں سیّدالطائفہ سے مل رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت حارث المحاسبیؒ سے ملاقات نصیب ہوئی۔ کیا معتزلہ کی تردید کے لیے علومِ عقلیہ اور علم الکلام لازمی ہے؟" جنابِ جنیدؒ نے جواب دیا...... "بیٹے، یہ عمل کچھ ایسا غلط بھی نہیں لیکن ضروری ہے کہ سب سے پہلے فتنہ کی تردید کے لیے قرآن و حدیث کو ایمان اور معیار بنایا جائے۔ ایک سچا عارف انہی ماخذات سے منکرین کو دلیل دے سکتا ہے۔ میں نے پہلے قرآن اور حدیث کی معرفت حاصل کی پھر حضرت حارثؒ کی صحبت میں پہنچا، بے شک وہ ولیٔ کامل ہیں لیکن اکثر لوگوں کو ان کی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔" میں نے حضرت جنیدؒ سے دیگر علوم کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا...... "جدید علوم نہ صرف مومن کا حق ہیں بلکہ ان تک رسائی لازمی ہے بس ایمان کی سلامتی ملحوظ رہے۔"

پھر فرمایا...... "میں بہت خوش ہوں کہ آپ اپنے روحانی سفر کے ساتھ ساتھ بارگاہِ نبوی ﷺ سے سونپے گئے فرائض بھی بہ احسن سرانجام دے رہے ہیں۔" میں نے عرض کی ...... "یہ سب اللہ کے کرم اور آپ بزرگوں کی شفقت و مہربانی کا ثمر ہے، ورنہ میرے جیسا شخص شاید یہ بار نہ اٹھا سکتا۔" حضرت جنیدؒ نے فرمایا...... "بادۂ توحید کی مستی سب سے بڑھ کر ہے، سارے علوم اسی میں ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ نے عہدِ حاضر کو آپ کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے، میں بحکمِ دربارِ رسالت ﷺ اُمتِ محمدیہ کی بھلائی کے لیے ہمیشہ آپ کا معاون رہوں گا۔" میں کلماتِ تشکر ادا کر کے آگے بڑھنے لگا تو سنا کہ حضرت جنیدؒ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ ج اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ط قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا

”اور جب آپ ﷺ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان سے اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب نے اقرار کیا کہ ہاں لاریب، ہم گواہی دیتے ہیں۔“ (الاعراف۔۱۷۲)

بلاشبہ تمام ارواح اقرار سے بندھی ہوئی ہیں۔ یومِ الست کو انسانی ارواح ہی نے یہ اقرار کیا تھا کہ بے شک تو ہی ہمارا رب ہے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ وہ جسمِ انسانی میں آنے کے بعد بھی اپنی اصل پر قائم رہیں گی اور آلائشوں کو قریب نہیں آنے دیں گی۔ اب جو کوئی حد سے تجاوز کر کے عہد شکنی اور وعدہ خلافی کا مرتکب ہوا وہ منکرین میں سے ہے۔ مومن کا فرض ہے کہ وہ عہد نبھائے اور نفس کو مات دیتے ہوئے روح کو اسی مقدّس اور پاک صورت میں اپنے رب کے پاس لے جائے جس شکل اور حالت میں وہ اسے امانتاً دی گئی تھی۔ مذکورہ آیت یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ اولادِ آدم کا اپنے رب کے ساتھ سب سے پہلا کلام وعدے اور اقرار کی صورت میں تھا۔ جب ربِّ کریم جگہ جگہ اپنے قول کی قسم کھاتا ہے تو بندے پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی اس قول و قرار کا پاس رکھے جو اس نے ساعتِ اوّلین میں اپنے رب کے ساتھ کیا تھا۔

حقیقی معرفت دراصل قولِ اوّل کے ساتھ منسلک ہے اور توحید کا آئینہ ہی حضوری کا ضامن ہو سکتا ہے۔ قارئین کے لیے فقیر کی ہدایت ہے کہ کمزور لمحوں میں مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کا شرف حاصل کریں تاکہ وعدے کی بازگشت اور اقرار کا ذائقہ زبان اور کانوں کو پھر سے پاک و صاف کر دے۔ راقم اس تصوف کو تصوف نہیں سمجھتا جو سالکین کو جبہ و دستار تو پہنا دے لیکن انہیں فہمِ دین سے ہمکنار نہ کرے۔

بدقسمتی سے ایسے حضرات عام ہیں لیکن اس زمانے میں بھی اہل اللہ کی موجودگی روح کو آسودگی اور دل کو تقویت عطا کرتی ہے۔

وعدے کی پاسداری اولیاء کا خاصہ ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ، حضرت محاسبیؒ اور حضرت جنیدؒ نے شام و عراق، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے حوالے سے کیے گئے تمام عہد نبھائے اور برزخ سے اپنے نمائندوں کو احکامات دیتے رہے۔ مذکورہ علاقوں میں ان عالی مقام بزرگوں کی سرپرستی کے بغیر مطلوبہ نتائج کے حصول میں تاخیر ہوسکتی تھی۔ جس طرح وہاں کے صوفیاء اور علماء نے عوام الناس کی ماہیتِ قلب میں اپنا کردار ادا کیا یقیناً یہ انہی نفوسِ قدسیہ کا خاصہ تھا۔ الحمدللہ اب یہ بات یقینی ہے کہ عراق و شام کے حوالے سے طاغوتی قوتوں کی ہر کوشش ان کے لیے رُسوائی اور جگ ہنسائی کا باعث بن جائے گی۔

اگلے قدم پر مسافر نے حضرت معین الدین چشتی اجمیری ؒ کو کلماتِ شکر ادا کرنے میں مصروف دیکھا تو بے تابی سے ان کی طرف قدم بڑھائے۔ میرے قریب آنے پر خواجۂ خواجگان نے اٹھ کر معانقہ فرمایا۔ عرض کیا ..... "مبارک ہیں وہ آنکھیں جنھوں نے سیدنا غوث الاعظمؒ کی زیارت کی اور زرّیں دور پایا۔" حضرتؒ مسکرائے اور فرمایا ..... "اویسی خوش بخت ہیں جنہیں حضرت اویس قرنیؒ سے آپ تک باعمل اور خوبصورت سربراہ میسر آئے۔" پھر فرمایا ..... "آپ نے اہلِ سلوک کے پانچوں امور بہ حسن وخوبی سرانجام دیے۔"

میرے استفسار پر وضاحت کی ..... "ماں باپ کا چہرہ دیکھنا اور پوری کوشش سے ان کی خدمت بجالانا، قرآنِ کریم کو دیکھنا اور اس کو سمجھ کر عمل کرنا، علماء کی زیارت کرنا اور ان سے فیض پانا، خانۂ کعبہ کو دیکھنا اور اس کی تعظیم کرنا، اپنے مرشد کو دیکھنا، ان سے فیض پانا اور خدمت کرنا۔ آپ نے حضرت باغ حسین کمالؒ کی فرزندگی کا حق ادا

کیا اور والدہ محترمہ کی خدمت گزاری میں فریضۂ حج ادا کیا۔ قرآنِ مجید کو سمجھ کے پڑھا اور عمل پیرا ہیں، مولانا اللہ یار خانؒ کی محفل میں شریک رہے، خانۂ کعبہ کی زیارت کے وقت وارفتگی کے عالم میں ربِ کریم کی حمد شاعری میں بیان کی اور بطور سالک اپنے شیخِ مکرّم کی وہ خدمت کی کہ تمام اہلِ برزخ خصوصاً حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فخر کا اظہار فرماتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے تمام امور ایک دوسرے سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔" فقیر نے الحمد للہ کہا اور اجازت لے کر آگے بڑھنے لگا تو مژدہ سنایا ..... "شیطنت پر اترے ہوئے حکمرانوں کو پاکستان کے خلاف مذموم عزائم پر عمل پیرا ہونے سے باز رکھنے اور ہندوستانی مسلمانوں میں جذبۂ ایمانی بڑھانے کے لیے اولیائے ہند کو طریقۂ کار سمجھا دیا گیا ہے۔" میں نے ایک بار پھر شکریہ کہا اور سلام عرض کر کے آگے روانہ ہوا۔

فقیر کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگلی منزل پر سلطان الصوفیاء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات نصیب ہوئی۔ آپؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالرزاقؒ کی قیادت میں بہت سے نامور اولیائے کرامؒ نے راقم کا استقبال کیا اور مجھے آپؒ کی خدمت میں لے گئے۔ غوثِ اعظمؒ نے پیشوائی فرمائی، اپنے پہلو میں بٹھایا اور میرے دونوں رخساروں پر بوسہ دے کر فرمایا "ہمارا اویسی بیٹا نسبت کا لحاظ خوب رکھتا ہے اور ان مقامات کو بہت دھیمے لہجے میں بیان کرتا ہے جو اسے عطا ہوئے۔ کیوں نہ ہو کہ اسے سارے شرف اور نسبتیں حاصل ہیں۔ میں ربِّ کریم کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے بیٹے کو ان مراتب کے لیے چنا جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے۔ تمام سلاسل کے سربراہ آپ کو اپنی نسبتیں عطا کرتے ہیں۔" میں نے فرطِ جذبات میں عرض کی ...... "یا شیخ میری سب سے بڑی نسبت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،

میرے حضرت جیؒ اور حضرت حاجی احمد ہیلانیؒ کے توسّل سے آپؒ ہیں لیکن آپؒ کے حکم کی تعمیل میں ان حضراتؒ کی نسبتیں شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔"

میں نے 'غنیّۃ الطالبین' کی بابت دریافت کیا تو نیم لب مسکرائے اور فرمایا "غنیّۃ الطالبین بے شک میری ہی تصنیف ہے۔" پھر تاکید فرمائی "جب دربارِ اقدسؐ میں باریابی ہو تو تمام نیک ارواح کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔" پھر آپؒ نے شانوں سے پکڑ کر سینے سے جو لگایا تو اللہ کے فضل سے تمام منازل یوں طے ہوئیں کہ روشنی سے موازنہ بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں احتراماً جھکا تو دعا دیتے ہوئے 'قصیدۂ غوثیہ' کی خصوصی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

راقم علماء اور فقہاء سے بھی ملا جنھوں نے نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ میرا شوق ملاحظہ فرما کر بہت سے کارآمد نکات بھی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے۔ برِصغیر کے مشہور فقیہہ حضرت مولانا ولی اللہ فرنگیؒ سے ملاقات پر میں نے آپؒ کی تفسیرِ قرآن 'معدن الجواہر' کی تعریف کی تو مسرور ہوتے ہوئے فرمایا...... "بیٹے، یہ سب کچھ توفیقِ ایزدی سے ممکن ہوتا ہے۔" پھر مجھے 'مرأۃ المومنین' کا کچھ حصّہ سنایا جو ایمان والوں کے لیے انمول تحفہ ہے۔ حضرت سیّد وحید الحق پھلواویؒ سے ملاقات کے دوران مسافر کوان کی لکھی ہوئی کلمہ طیبہ کی بے مثل شرح انھی کی زبانی سننے کی سعادت بھی میسر آئی۔ آپؒ نے میرے سامنے بڑے لطیف اور باریک نکتے کھولتے ہوئے فرمایا..... "شرح کلمۂ طیبہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں بھی فضیلت حاصل ہے۔"

اگلی ملاقات برہان پور کے صاحبِ کشف فقیہہ حضرت سیّد نصیر الدین حسینیؒ سے ہوئی اور بہت سے اسرار کھلے۔ بے شک 'شعب الایمان' اور 'تنبیہ الاغنیاء فی فضائل سیّد الاصفیاء' آپؒ کی لاجواب تصانیف ہیں اور نافہموں پر کڑی گرفت کرتی ہیں۔ ان

حضرات کے علاوہ راقم جن فقہا سے ملا ان میں حضرت سیّد محمد لطیف مچھلی شہریؒ، حضرت مولانا محی الدین عثمانی بدایونیؒ، حضرت محمد برکت عظیم آبادیؒ، حضرت مولانا محمد علی بھیرویؒ، حضرت غلام محمد لاہوریؒ، مولانا کریم اللہ فاروقیؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے اسمائے گرامی دمِ تحریر ذہن میں فروزاں ہیں۔ ان تمام حضرات نے فقیر کی ہر طرح سے رہنمائی فرمائی اور عطاؤں کے در کھولتے ہوئے علوم کی نسبتوں سے نوازا۔ اللہ ان پر دائم اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور اُنہیں بلندئ درجات عطا ہو۔ آمین

فقیر آگے بڑھا تو ایک نورانی صورت بزرگ قریب آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں کچھ پوچھے بغیر اُن کے پیچھے چل دیا۔ وہ ایک مقام پر آ کر ٹھہرے اور مجھے وہیں رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اپنے جیسے بہت سے پُرنور بزرگوں کے ہمراہ واپس تشریف لائے اور فقیر کی تکریم کرتے ہوئے دائرے میں لے کر آگے بڑھے تو ایک مقام پر اپنے شیخ اور والدِ گرامی حضرت جی باغ حسین کمالؒ کو تشریف فرما دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اُن کے گرد بے شمار افراد تھے جو آپؒ کی آواز میں آواز ملا کر درود شریف پڑھ رہے تھے۔ میں بھی شریکِ ورد ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آوازیں تھم گئیں تو حضرت جیؒ میری جانب بڑھے۔ میں نے اُن کی قدم بوسی کی اور مبارک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر کہا "سبحان اللہ، یہاں بھی درود شریف جاری ہے۔" مجھے سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا ........ "بیٹے الحمدُللہ آپ بھی اپنی روحانی مسافت کے دوران بسم اللہ شریف اور درودِ پاک سے اپنی زبان مشکبو کیے ہوئے ہیں۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ آپ سلسلۂ عالیہ کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں اور دوسرے وظائف کی زیادتی کے باوجود حسبِ ہدایت دربارِ اقدس ﷺ میں روزانہ درود شریف کے پھول پیش کرتے ہیں۔" میں نے عرض کی ..... "شیخِ محترم کی عطا اور حکم کو پسِ پشت ڈال کر

فقیر اور اس کے ساتھی ناشکری کے مرتکب کیسے ہو سکتے ہیں۔ تحدیثِ نعمت پہ اصرار اور کفرانِ نعمت سے انکار ہی تو تصوف ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو کبھی کمی محسوس نہیں ہو گی۔"

یہ سن کر حضرت جیؒ کا چہرۂ انور فرطِ مسرت سے اور بھی تابندہ ہو گیا۔ فرمایا.....

"بیٹے الحمدُللہ آپ نے بہت محنت اور معاملہ فہمی سے کام لیا ہے۔ آپ کو تفویض کردہ امور کے حوالے سے اکابر اولیائے کرامؒ کو ہدایات جاری کی جا چکی ہیں، ان شاء اللہ کامیابی کی منزل دور نہیں۔" میں ادب سے سرخمیدہ کھڑا رہا کہ نگاہ قدموں سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔ فرمانے لگے"..... بیٹے اللہ کا شکر ہے کہ برزخ کے دوست اور تمام آسمانوں کی نوری مخلوق درود شریف کے ورد میں ہماری تعداد پر حیران ہے۔ بے شک اللہ نے اپنے بندے پر یہاں بھی کرم کے در کھلے رکھے ہیں۔" میں نے عرض کی .....

"یہ تائیدِ باری تعالیٰ اور عشقِ رسالت مآبؐ ہے کہ فقیر آپ کے سپرد ہوا اور اس نسبت کے صدقے فضیلتِ درود شریف کی سمجھ نصیب ہوئی۔"

دُرود شریف کی فضیلت و اہمیت کے حوالے سے یہ نکتہ یقیناً قارئین کی دلچسپی کا حامل ہو گا کہ کسی بھی شے کی حقیقت جاننے اور اس کا معیار پرکھنے کے لیے کوئی پیمانہ اور کسوٹی مقرر کی جاتی ہے۔ مثلاً علمِ نباتات (Botany) کے حاملین درختوں اور پودوں کے اجزاء و اصناف کی جانچ (Dendrology) کے اصولوں کے تحت، ماہرینِ آثارِ قدیمہ (Archeologists) اشیاء و نوادرات کی شناخت (Archaeometry) کے قوانین کی روشنی میں اور شعرائے کرام اشعار اور مصرعوں کا وزن 'علمِ عروض' کے ذریعے معلوم کرتے ہیں۔ اسی طرح ربِّ کریم نے نے بھی مومن کی پہچان کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ یہ آیتِ مبارکہ......

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ۝

"اللہ اور اس کے فرشتے نبی کریمؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی آپؐ پر درود و سلام بھیجو۔" (الاحزاب۔۵۶)

بھی دراصل ایک کسوٹی ہے کہ سچے و کامل مومن اور اللہ کے پسندیدہ بندے وہی ہیں جو نبی کریمؐ کی بارگاہ میں درود شریف کی سوغات پیش کرتے ہیں۔ درود شریف دراصل سنتِ الٰہی ہے جس کا دامن تھامنے سے گویا خالقِ کائنات کی آرزو بَر آتی ہے اور وہ ایک عالمِ سرشاری میں اپنے بندے کو نوازتا چلا جاتا ہے۔ تاہم قرآن و حدیث میں بکھرے یہ اسرار و رموز کسی ولیٔ کامل کی صحبت میں بیٹھے بغیر عیاں نہیں ہوتے۔

پھر حضرت جیؒ نے فرمایا...... "تابش صاحب، ایک اور وظیفہ بطور تحفۂ خاص مقرر کیا جاتا ہے۔ ہدایت ہے کہ سورۃ کوثر بعد از نمازِ عشاء سو بار تلاوت کیا کریں، لیکن یہ صرف آپ کے لیے ہے۔" (پھر پڑھنے کا طریقہ کار سمجھایا) اس کے بعد مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ...... "اللہ نے یہ سورہ بولہبیوں کو تا حشر اور اس کے بعد بھی خوار و زبوں رکھنے کے لیے اتارا۔ مجھے خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے حکم دیا ہے کہ اس کی نسبت ان کی طرف سے عطا کی جائے۔" (اپنی مُسافت کے بعد فقیر دربارِ خاص میں باریاب ہوا تو مادرِ مہربانؓ نے اپنا بیٹا قرار دیتے ہوئے خود بھی مذکورہ سورۃ کی اجازت مرحمت فرمائی)۔ اسی دوران حضرت جیؒ کو دربارِ اقدسؐ میں طلب فرمایا گیا تو آپؒ نے اپنے عاجز مرید اور بیٹے کو بہت سے دیگر انعامات و تحائف سے مالا مال فرما کر دُعاؤں کے ساتھ اگلی منزل کی جانب روانہ کر دیا۔

راقم دربارِ اقدسؐ میں حاضری کے بعد حضرت علی المرتضیٰؓ اور حسنینِ کریمینؓ کی زیارت کو اپنی زندگی کے سعد ترین لمحات میں شمار کرتا ہے۔ ان ہستیوں نے لطف و کرم کے خزانے کھول دیے اور یہ انہی کا فیضان تھا کہ برزخ میں میری طویل ترین ملاقات

مرتب القرآن اور قاری القراء حضرت زید بن ثابت انصاریؓ سے ہوئی جنھوں نے بہت شفقت اور توجہ کے ساتھ مجھے اپنے روبرو بٹھایا اور فرمایا ”میں منتظر تھا، آپ کے حوالے سے مجھے کچھ ذمّہ داری سونپی گئی ہے۔“

میں نے سر جھکا کر عرض کیا..... ”جناب سے اللہ اور شیخینؓ نے وہ کام لیا جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا، آپؓ ہی نے کلامِ الٰہی کو اکٹھا فرمایا اور ایسے گواہ پیش کیے جنھیں بحمد للہ قیامت تک کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ آپؓ کی احتیاط پسندی نے آج تک اُمت کو گمراہ نہیں ہونے دیا اور تمام مسلمان ایک قرآن پر متفق اور جمع ہیں۔“ میری بات پر ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، فرمایا..... ”بیٹا یہ بہت مشکل، صبر آزما اور دِقّت طلب کام تھا۔ اللہ کی نصرت شاملِ حال نہ ہوتی، نبیؐ کریم سے آخری دورۂ قرآن نہ کیا ہوتا اور پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہمت نہ بندھاتے تو اس خدمت کی انجام دہی ناممکن تھی لیکن اللہ قوی ہے جس سے چاہتا ہے کام لے لیتا ہے۔ پھر وہ زمانہ بھی عجیب تھا کہ کفار قرآنِ مجید کے ارشادات کو فرموداتِ رسولؐ سمجھتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ○ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ○ (النجم۔۳،۴)

”وہ (یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ”بے شک، اس میں کیا کلام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رضائے ربانی کے سوا کسی جانب ملتفت نہ ہوتے اور وہی فرماتے جو جبریلِ امینؑ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچاتے۔ یا حضرتؓ! آپ کاتبِ وحی بھی ہیں۔ براہِ کرم ارشاد فرمائیے کہ اس دور میں قرآنِ کریم کی کتابت اور ظاہری تحفّظ کے کیا وسائل تھے۔“ اس پر حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا...... ”ہم عسب (کھجور کی چھال)، قتب (اونٹوں کے پالان کی لکڑی)، قضیم (سفید چمڑا)، لخاف (سفید نفیس پتھر) اور حریر (ریشمی کپڑا) وغیرہ استعمال کرتے تھے تاہم آخری دنوں میں رَق (پتلا چمڑا) اور قراطیس (کاغذ) نسبتاً زیادہ مصرف میں لاتے تھے۔ ہم

کاغذوں کو کھال میں لپیٹ کر غلاف کر لیا کرتے تھے تاکہ عبارت اور کاغذ محفوظ رہے۔''میں نے عرض کیا..... ''بے شک قرآنِ مجید فرقانِ حمید نے واضح طور پر اپنے کلامِ رب ہونے کی دلیل دی ہے:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمدؐ نے) از خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنالاؤ اور اللہ کے سوا جسے بھی بلا سکتے ہو بلالاؤ۔'' (یونس۔۳۸)

لیکن کوئی ایک بھی سورہ بطور مثال نہ لا سکا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ ربِّ کائنات نے قرآنِ مجید کی حفاظت کا وعدہ بھی تو فرمایا ہے۔''حضرت زید بن ثابتؓ میری بات پر خوش ہوئے اور فرمایا..... ''وقت کم ہے اور ابھی آپ کو کافی مسافت طے کرنی ہے۔ مجھے قرآنِ کریم کے کچھ موضوعات پہ روشنی ڈالنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔''میں اس کرم نوازی پر شکر گزار ہوا تو ارشاد فرمایا..... ''پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم ہر دور کے علم و عمل کا خزانہ ہے۔ اس میں کائنات کے ارتقاء سے لے کر روزِ حشر تک تمام باتوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ سورۃ النّٰزِعٰت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۝ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰٮهَا ۝ وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰٮهَا ۝ وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰٮهَا ۝ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰٮهَا ۝ (۲۷۔۳۱)

''کیا تمہارا خلق کرنا دشوار ہے یا اس آسمان کو جسے اس نے بنایا؟ اللہ نے اس کا سَقف اُونچا کیا، پھر اسے معتدل بنایا اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو روشن کیا پھر اس نے زمین کو بچھایا، اس سے پانی اور چارہ نکالا۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًاؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝ (حم السجدہ۔۹،۱۰)

"کہہ دیجیے، کیا تم اس ذات کے منکر ہو اور اس کے لیے مدِّ مقابل قرار دیتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا! وہی تو عالمین کا رب ہے اور اسی نے زمین کے اوپر پہاڑ بنائے، اس میں برکات رکھ دیں اور اس میں چار دنوں میں ضرورت مندوں کی ضرورت کے برابر سامانِ خوراک مقرر کیا۔"

بیٹے! قرآنِ مجید نے کائنات کی پیدائش اور مالک الملک کی نشاندہی فرما دی اور بتا دیا کہ اللہ ہی مسبّب الاسباب ہے۔ دیکھیں وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (النّٰزعٰت۔۳۰) کا ترجمہ لوگ یہ بھی کرتے ہیں "اس کے بعد اس نے زمین کو بچھا دیا" لیکن اس کا زیادہ مفید ترجمہ یہ ہے "اس کے بعد اس نے زمین کو حرکت دے دی۔" میں نے عرض کیا...... "سبحان اللہ! یہ ترجمہ تو جدید سائنسی نظریات کے بھی عین مطابق ہے۔" اس پر آپؒ نے فرمایا "اَلدَّحٰی" کا مطلب پھینکنا اور حرکت دینا بھی ہے۔ اللہ نے زمین کو اس کے مدار میں یوں رکھ دیا کہ اپنی جگہ برقرار ہے اور حکمِ الٰہی کے بغیر ہل نہیں سکتی۔

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَاۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝

"اللہ آسمانوں اور زمین کو یقیناً تھامے رکھتا ہے کہ یہ اپنی جگہ نہ چھوڑ جائیں۔ اگر یہ اپنی جگہ چھوڑ جائیں تو سوائے اللہ کے انھیں کوئی تھامنے والا نہیں۔ یقیناً اللہ بڑا حلیم اور بخشش کرنے والا ہے۔" (فاطر۔۴۱)

تو بیٹے، کائنات کا یہ توازن باری تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔ وہی ہے جو تمام مخلوقات اور اشیاء کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ قیامت کے روز زمین بحکمِ خداوندی اپنے حالات خود بیان کرے گی۔ قرآنِ کریم میں انسان کی پیدائش پر بات کرتے ہوئے خالقِ اکبر فرماتا ہے:

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ (القیمہ۔۳)

"کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔"

وَانۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُھَا ثُمَّ نَکۡسُوۡھَا لَحۡمًا ط

"پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انھیں اٹھا کر پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔" (البقرۃ۔۲۵۹)

گویا قرآن وجودِ خدا کی دلیلیں بھی دیتا ہے، توحید کو مرکزی نقطۂ کائنات بھی کہتا ہے اور محسوس دلیلوں کے ذریعے اللہ کی حقانیت بھی ثابت کرتا ہے۔ سورۂ انعام، سورۂ بقرہ، سورۂ نحل، سورۂ حج، سورۂ قصص، سورۂ ابراہیم اور سورۂ یونس میں تو باقاعدہ وجودِ الٰہی کے ثبوت ہیں جبکہ باقی سورتوں میں بھی اس موضوع پر آیات ملتی ہیں۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران، سورۂ اخلاص، سورۂ انبیاء، سورۂ مومنون اور دیگر میں توحید کی دلیلیں موجود ہیں۔ سورۃ الزمر، سورۃ الرعد اور سورۃ المائدہ میں تو ربِّ ذوالجلال نے توحید کی قسمیں بھی بیان فرمادی ہیں۔ بقائے ذات اور اللہ کے اسماء وصفات کا نہایت واضح اور دلکش بیان سورۂ مومن، حشر، اعراف، روم، یوسف، حدید، بنی اسرائیل اور نساء، میں مرقوم ہے۔ مزید یہ کہ سورہ زخرف، کہف، جاثیہ، فرقان، عنکبوت اور مومن میں آپ کو ذکر اللہ اور حکمت اللہ کے متعلق بہت ساری ہدایات ملیں گی جن کی روشنی میں ایک مسلمان اپنی منزل تک بخیر وخوبی اور سلامتئ ایمان کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے باب میں سورۂ حشر، سورۂ توبہ، سورۂ الم نشرح، سورۂ نجم،

سورۂ قصص اور سورۂ ہود کے علاوہ بھی کئی مقامات پر آیات موجود ہیں جن سے آپؐ کا خاتم النبیینؐ ہونا اور پہلی کتابوں میں آپؐ کے ذکر کا ثبوت ملتا ہے۔'' اس سحر انگیز گفتگو سے روح سرشار تھی کہ اچانک حضرت زیدؓ نے خاموشی اختیار فرمالی۔ میں بیان جاری رکھنے کے لیے ملتمس ہوا تو آپؓ نے فرمایا ......... ''مجھے اتنی ہی ہدایت کی گئی تھی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ قرآنی تعلیمات کی اگلی منازل آپ بفضلِ الٰہی خود طے کرلیں گے۔ اللہ آپ کا نگہبان ہو۔ جب دربارِ رسالتؐ میں حاضری ہو تو میری طرف سے عرض کر دیجیے گا کہ زید بن ثابت نے اپنا فرض نبھا دیا ہے۔'' مسافر نے آپؓ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور آگے بڑھا۔

مقامِ شکر ہے کہ اللہ کریم نے اپنے اس حقیر بندے پر بے پایاں احسان کیا اور اسے اعزازات عطا کر کے خدمتِ دین میں مقدور بھر حصہ ڈالنے کے قابل بنایا۔ برزخ سے جو انعامات وتحائف ملے ان کا احاطہ اختصار سے ممکن ہی نہیں۔ کئی واقعات وکرامات کی تصدیق ہوئی اور عشقِ نبیؐ کے صدقے ''محب الرسول ﷺ'' کا لقب بھی عطا کیا گیا۔ تاہم اس حقیقت کا اعتراف مجھ پر لازم ہے کہ نبئ کریمؐ کی نظرِ کرم اور میرے شیخِ محترم کی توجہ شاملِ حال نہ ہوتی تو اس باسعادت مسافت کا اعزاز کبھی حاصل نہ ہوتا اور نہ ہی درس کی یہ نعمتیں میسّر آتیں۔

مسافتِ برزخ کے بعد سیرُالافلاک آغاز ہوئی تو پہلے فلک سے ہوتا ہوا یہ عاجز دوسرے فلک پر پہنچا جہاں ہر طرف سیاہ وسفید منظر تھا۔ حقیقتِ فکریہ کی چہار سُو پھیلی خوشبو میں 'یا قدیر' کی آواز سُنی اور اس دل کشا ماحول میں گونجتی صداؤں کی پیروی کی۔ علیم وخبیر کی حقیقت اور قدیر کی ہیبت اس فلک میں عیاں ہے۔ یہاں فقیر نے اہلِ ہُنر کی نصرت پر مامور فرشتے دیکھے جو ایجادات و اختراعات میں اُن کی معاونت کرتے اور کارہائے نمایاں کی انجام دہی میں مددگار رہتے ہیں۔ یہاں کے ملائکہ اپنے مقام پہ رہتے ہوئے بھی دوسرے فلک کے فرشتوں کی صدائیں سنتے ہیں۔ فلکِ دوم میں فقیر کے مشاہدات اس نوع کے ہیں کہ رحمت اور کرم ہی اصطلاحی سطح پر انھیں بیان کر سکتے ہیں۔ اس مقام پہ رحمانیت کا سیاق وسباق واضح ہوتا ہے اور ایسے فرشتوں کا دیدار ہوتا ہے جو نورانی تاجوں کے ساتھ اڑان کرتے ہیں اور ان کا اذنِ پرواز ساتوں افلاک تک بار پا سکتا ہے۔ یہاں سمجھتے چلیں کہ اگرچہ لغوی اعتبار سے 'فلک' اور 'آسمان' ہم معنی الفاظ ہیں لیکن حقیقی طور پر یہ ایک دوسرے کے مترادف و مماثل نہیں۔ ہر فلک کے سات آسمان ہیں۔ آسمان کی حیثیت فلک کے مقابل ذیلی ہے تاہم راقم یہاں ہر فلک کی مجموعی کیفیت ہی بیان کرے گا۔

فلکِ دوم پر ہر طرف معرفت وکرامت کا ظہور ہے اور ایسے قدسی ہیں جو گرد وپیش سے بے نیاز مخصوص عبادات میں مشغول ہیں۔ یہ باری تعالیٰ کی عظیم ترین نشانیوں میں

سے ایک نشانی ہے۔ یہاں پر متمکن حضرت نوحؑ اور فلکِ ہفتم پر جلوہ نشیں حضرت ابراہیمؑ کے فیوض و برکات اسی فلک سے ایک سالک کے دل پر وارد ہوتے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے عنایات کے ذریعے فقیر پر کرم نوازی کی اور فرمایا..... "کچھ امانتیں شیخ چوگانیؒ (گجرات والے)، حضرت طانوخؑ اور حضرت امنونؑ کے پاس رکھی ہیں، واپسی پہ انھیں لیتے جانا۔" تسلیمات کے ساتھ تحائف کا شکریہ ادا کیا تو فرمایا..... "ابھی اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام اور پاکستان کے لیے آپ سے بہت سارے کام لینے ہیں۔ مبارک ہو کہ آپ نبیٔ کریم ﷺ کی چشمِ توجہ کے باعث چن لیے گئے۔" پھر حضرتؑ نے اس فلک سے متعلق اسرار بیان فرمائے تو معلوم ہوا کہ اس کے سفید و سیاہ رنگ کا سبب کیا ہے اور کیسے یہاں کے فرشتے ارواح اور اجسام کو باہم ملا دیتے ہیں۔

تصوف کے طالب علم کو یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا بیان احاطے میں نہیں آ سکتا۔ وہ بے حد ہونے کے علاوہ جلالِ مطلق، جمالِ مطلق اور کمالِ مطلق بھی ہے۔ کائنات ابھی درجۂ ارتقاء میں ہے اور یہ عمل ایسے ہی جاری رہے گا کہ کمالِ مطلق تک پہنچنا اس کے لیے محال ہے۔ دراصل خود حق بھی ترقی پر ہے کہ خلق کے سامنے اس کا ظہور ابھی مکمل نہیں ہوا۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ اسی جانب اشارہ ہے۔ بے شک اللہ کریم کی شان ہر دم نئی ہے اور اس کے پیدا کردہ مظاہر میں اس قدر تنوّع ہے کہ کھربوں برس دیکھتے رہو تو رعنائی اور جہتیں ختم نہ ہوں۔ ربِّ کریم نے جب اظہارِ ذات کا ارادہ کیا تو عدم اس کی تجلیٔ ذات سے وجود میں آیا۔ اشیاء و مظاہر ظاہری وجود پا کر موجودات کہلائے لیکن حقیقتِ مطلقہ اس کائنات میں صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے اور باقی کارخانۂ عالم اس کی عظمت کا ادنیٰ سا اظہار۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے پا کر عارف توسل اور وصل کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ معرفت کی اصل یہی تو ہے

کہ مظاہر کی نوعیت اور ماہیت اسے خالق سے جوڑ دے۔ یہ جھومتے درخت اور لچکتے نہال، مہکتے شگوفے اور کلام کرتے پھول، زمزمہ کرتے طائر اور کلیلیں کرتے غزال غرض کہ ہر جاندار اور بظاہر بے جان مخلوق اس ذاتِ واحد کی شاہد ہے جو اُن سے بے نیاز ہونے کے باوجود ان کی نگہبان و محافظ ہے اور انہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ روحانی مسافت میں مظاہر کی اصل اور حقیقت کھل جاتی ہے مگر یاد رہے کہ سالک کا شوق اور مجاہدہ ان معارف تک اسی وقت رسائی پا سکتا ہے جب مرشدِ کامل کی نگاہ اسے کیمیا کر دے۔ اللہ کا فضل و کرم عارف کے ساتھ ہو تو فاصلے مٹ جاتے ہیں اور من و تو کا فرق محسوس ہی نہیں ہوتا۔ فقیر نے توفیقِ الٰہی کے مطابق نورِ محمدیؐ کی ضیاء میں مظاہر کا اصلی بانکپن دیکھا اور سبحان اللہ کی تسبیح کرتا رہا۔ دوسرے فلک کے برق رفتار شہابیے اور مشرکین پر ان کا بموں کی طرح گرنا دیکھا۔ یہ مشرکوں کے حواریوں کو خاکستر بنا دیتے ہیں اور نورِ احمد مرسلؐ کی شان سالک پر عیاں ہوتی جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ارضی سطح پر اس وقت رونما ہوتی ہے جب عارف منکرینِ ختمِ نبوت کے سامنے درود شریف کا ورد بآوازِ بلند کرتا ہے تو ان کے سیاہ دل راکھ ہو جاتے ہیں۔ فقیر کی دعا ہے کہ شمعِ رسالتؐ کے پروانوں کا یہ سوز سلامت رہے اور وہ اسوۂ رسول ﷺ پر عمل پیرا ہو کر اس تجلیٔ کردار کو فروغ دیں جو رسالت مآبؐ کا انکار کرنے والوں کے لیے ہدایت اور ان کے اپنے لئے نجات کا باعث بنے۔

اس مسافت میں مجھے حضرت نوحؑ کے سامنے 'سورۃ نوح' کی تلاوت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ آپؑ نے اس کا اذن دیتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ سورہ کی تلاوت حاسدین اور دشمنوں سے حفاظت اور چڑھے ہوئے پانی کو شانت رکھنے کے لیے نہایت اکسیر ہے۔

اگلی منزل میں محبت ہی محبت تھی۔ یہ تیسرا فلک ہے۔ یہاں محبت پھونکنے والے فرشتے ہیں جن کا رُوپ سراسر جمال اور حب ہے اور ان کی اتنی صورتیں ہیں کہ شمار ممکن ہی نہیں۔ ان فرشتوں پر ملک صورائیل حاکم ہیں۔ اسے فلکِ زہرہ بھی کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ خیال حقیقت کا عکس نہیں، خود ایک حقیقت ہے۔ اس زردی مائل آسمان کے عجائب مثالی (آئیڈیل) سطح پر ظہور پذیر ہونے کے باعث انسانی فہم میں نہیں سما سکتے۔ یہاں کے ملائکہ انسانی آوازوں کو پوری طرح نہ صرف سنتے ہیں بلکہ پاکبازوں کو جواب بھی دیتے ہیں۔ ان فرشتوں کے ذمے مختلف کام ہیں اور وہ ان امور کی انجام دہی میں نہایت خوش سلیقہ اور ذمہ دار واقع ہوتے ہیں۔ معاونت و موانست اور دستگیری کے علاوہ تربیت، تسلی، دلاسا، خیر خواہی اور غم خواری جیسے امور اسی مخلوق کے سپرد ہیں۔ یہاں وہ صورتیں ہیں جو محبت کے چراغ جلاتیں، پیار کے پھول کھلاتیں اور عشق و اخلاص کو فروغ دیتیں ہیں۔ یہاں حضرت یوسفؑ ایک تخت پر تشریف فرما ہیں۔ آپؑ نے اس عاجز کے سلام پر جواب سے نوازا اور 'سورۃ الضحیٰ' کا اذن عطا کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی بکثرت تلاوت متاعِ گم گشتہ کی بازیافت کے لیے مفید ہے۔ سورۃ الضحیٰ کے متعلق حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی جب روح الامین حضرت جبرائیلؑ کی آمد کا سلسلہ کچھ عرصہ موقوف رہا اور اس دوران مشرکین نے گرد و نواح میں مشہور کر دیا کہ نعوذ باللہ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس پر اللہ نے یہ سورۃ نازل کی، متوسلین کو ہدایت ہے کہ روزانہ ایک بار اس سورۃ کی تلاوت کا شرف ضرور حاصل کریں۔ دمِ وداع آپؑ نے اذنِ تعبیر دان کرتے ہوئے اس سوغات کے تسلسل کی نوید بھی سنائی۔

سالک کے لیے فلکِ سوم کی کیفیت میں اتنا جاننا لازمی ہے کہ یہاں عالم اور جاہل دونوں کا گزر ممکن نہیں۔ بس عارف ہے کہ متاعِ عشق اور دولتِ ایمان کے

صدقے ہمہ وقت رواں رہتا ہے۔ مظاہر کا پردۂ چشم پر حاوی ہو جانا عشق کی ابتدائی منزل اور مسافتِ سلوک کا نقطۂ آغاز ہے جبکہ اگلے سفر میں مظاہر کی نوعیت و ماہیت زائر اور ناظر سے کلام کرتی ہے۔ سو اگر کسی طالب کا اثاثہ اس ضمن میں کافی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ربِّ کریم اسے اس آسمان تک رسائی سے محروم رکھے۔ یہاں انوار کی رمزیں اور معنی کی پرتیں پوری طرح کھل جاتی ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں عاشق محبوب کی صورت دیکھ سکتا ہے لیکن صاحبانِ توفیق یہیں نہیں رک جاتے کہ یہ صورتیں عارف کا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتیں۔ زہرہ مجازی عاشقوں کا محل ہے، حقیقی مومن کی معراج نہیں لیکن یاد رہے کہ ہر مجازی مبتلا بھی یہاں تک رسائی نہیں رکھتا۔

جدید تعلیم یافتہ لوگ سمجھ لیں کہ یونانی تصورِ عشق و محبت دراصل فلکِ زہرہ ہی کی ایک بگڑی ہوئی جہت ہے۔ انھوں نے صرف کیوپڈ دیوتا (Cupid) کا شوشہ گھڑ لیا جو اُن کے بقول دو دلوں میں محبت کا تیر چلاتا اور ان میں اُنس پیدا کرتا ہے۔ فقیر اس لایعنی تصور کے حوالے سے بس اتنا ہی کہے گا کہ عشق کوئی اختیاری جذبہ نہیں کہ اس میں ارادۃً مبتلا ہوا جا سکے یا نکلا جا سکے۔ وہ لوگ جو رواجاً یونانی عقیدے سے متاثر ہو جاتے ہیں کتابی علم سے آگے نہیں جا سکتے اور کتابی علم بہرحال حرفِ آخر نہیں ہوتا، یہ تجربے کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی مسافت کے لیے زمینی پیمائشیں کام نہیں آتیں۔ شائق اور سالک پر لازم ہے کہ جن مخلوقات و مظاہر کا بیان پڑھ رہا ہے ان کی موجودگی پر ظن و گمان سے بچے۔ ایسا پرہیز صائب ہے اور سود مند بھی۔ بصورتِ دیگر ایمان کے زیاں اور نقصان کا احتمال ہے۔ ملائکہ کی جن جن حالتوں کا ذکر ہوا ہے وہ صرف چشمِ حق بیں کے مشاہدے میں ہی آ سکتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ پاک ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ

"اور وہ فرشتے جو عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور اس پہ ایمان لاتے ہیں اور مومنوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تیری رحمت اور علم میں ہر شے سمائی ہے۔ تو انھیں بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے۔" (المومن۔۷)

ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ملائکہ کو جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں وہ ان کی انجام دہی میں نہایت انہماک وتندہی سے مصروفِ عمل ہیں اور قطعاً کوئی غلطی نہیں کرسکتے گویا ان کی مرضی اور اختیار ہے ہی نہیں۔ ملائکہ اس قدر متنوّع صورتوں کے حامل تھے کہ ان کا بیان ممکن ہی نہیں ہے۔ بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے اور یہ صرف اسی ذاتِ قدیم کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ ایک ایک مخلوق میں لاتعداد جلوے اور ان گنت جہتیں رکھ دے اور اگر چاہے تو اسے بے شمار صورتوں سے مزیّن کر دے۔

فقیر کا اگلا پڑاؤ نجوم کا مآخذ تھا۔ وہ جگہ جہاں روشنی کی افراط ہے اور اس کی بنیاد واساس دل ہے۔ یہاں الوہیت اپنی عجب شان سے جلوہ گر ہے۔ یہیں سے انوارات نازل ہوتے ہیں اور قلب کی حقیقت سالک پر متجلی ہوتی ہے۔ یہ چوتھا فلک ہے جہاں حضرت اسرافیلؑ ملائکہ کے حاکم ہیں۔ اللہ نے تمام انتظام ان کے تصرف میں دے رکھا ہے اور آپؑ کی رسائی تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ فلکِ چہارم کا آفتاب اللہ تعالیٰ کے پاک اوصاف کا جلوہ خانہ ہے۔ اس کا محیط بہت روشن ومنور اور

کشادہ ہے جس میں ہر سُو قلب کا نُور جاری و ساری ہے۔ یہاں حضرت ادریسؑ رونق آراء ہیں۔ حضرت داوٗدؑ و سلیمانؑ وغیرہم اپنے اپنے مخصوص مقامات پر اُن کے ہم فلک ہیں اور انوار و اسرار سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ سب نے اس عاجز کو شرف بخشا اور نگاہِ کرم سے نوازتے ہوئے رہبری فرمائی۔ حضرت سلیمانؑ نے مخصوص و منفرد اسمائے ربانی میں سے کچھ راقم کو بھی عطا فرمائے جبکہ حضرت داوٗدؑ نے چند پاکستانی اربابِ اختیار کے لیے پند و نصائح کی امانت سونپی جو روحانی طور پر متعلقہ لوگوں تک پہنچا دی گئی۔

حضرت عیسیٰ روح اللہ نے اذنِ شفا بخشا اور خبر دار کیا کہ ایک وقت آئے گا جب آپ کو بطور امتحان ایک زندہ آدمی کا جنازہ پڑھانے کو کہا جائے گا۔ پھر اس شخص کے خدو خال بیان فرماتے ہوئے اس چال سے باخبر رہنے کی تلقین فرمائی۔ مزید فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی، ہر دور میں اہل اللہ کی آزمائش کے لیے طاغوتی ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ حضرت علیؓ کو آزمانے کے لیے بھی منکرین نے یہی حربہ آزمایا تھا۔ آپؓ کے جنازہ پڑھانے پر وہ شخص حقیقتاً مر گیا تو گریہ وزاری کرنے لگے۔ یہ سن کر مجھے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حوالے سے 'اخبار الاخیار' میں درج اسی طرح کا ایک واقعہ یاد آنے لگا اور یہ حدیث قدسی دل میں روشن ہوگئی کہ.....

"جس نے میرے ولی سے دشمنی کی اس کے ساتھ
میرا اعلانِ جنگ ہے۔" (بخاری شریف)

فقیر حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ گرہ میں باندھ کر آگے روانہ ہوا، بعد ازاں اللہ کے فضل و کرم سے یوں سرخرو ہوا کہ سازش کرنے والوں میں سے ایک صاحب روتے ہوئے میرے پاس آئے اور سب ماجرا سنا ڈالا۔ پھر بتایا کہ انھیں خواب میں حضرت علی المرتضیٰؓ کی زیارت ہوئی اور انھوں نے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ لوگ باز نہ آئے تو

مردہ خاندانوں کے وارث ہوں گے۔فقیر نے اس کے معافی مانگنے پہ پردہ پوشی کا وعدہ کرتے ہوئے تسلی دی اور آئندہ محتاط رہنے کی ہدایت کی۔

چوتھے فلک کا رنگ احمریں ہے اور اس لہو رنگ فضا پر ہر جانب رعب، دبدبے اور جلال کی حکمرانی ہے۔اس فلک کے ملائکہ عابدوں کو حضوری کی طرف رغبت دلاتے اور امکان کو واقعیت عطا کرتے ہیں۔ دلوں میں عشق و ایمان کی پختگی کے علاوہ ارادوں کے استحکام جیسے معاملات کی نگرانی بھی ان فرشتوں کے فرائض میں شامل ہے۔اہل اللہ کی نصرت وامداد کے لیے فرشتے بھی اسی فلک سے اترتے ہیں جن کے حاکم ملک الموت حضرت عزرائیلؑ ہیں۔سلام کرنے پر حضرت یحییٰؑ نے فرمایا کہ جنگِ بدر میں یہیں کی نوری مخلوق لشکرِ محمدی ﷺ کی نصرت پر مامور تھی۔ پھر آپؑ نے فقیر کو سورۃ سجدہ کا اذن بھی عطا کیا۔یہ وہ سورۃ ہے جسے حدیث شریف کی رو سے دیگر سورتوں پر ساٹھ درجے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔آپؐ خود بھی اس کی بکثرت تلاوت فرماتے اور اسے بہت محبوب جانتے تھے۔

حضرت یحییٰؑ نے مُسافر کو بہت سے اسم بھی تعلیم فرمائے۔علم کا معاملہ یہ ہے کہ معارف سے پست مگر باقی درجات سے بلند ہے یعنی عارف کی طبیعت پر اکسیر کا کام کرتا ہے اور اسے یوں صیقل کرتا ہے کہ طِلا ماند پڑ جائے۔ارشادِ نبویؐ ہے:

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَآء (مشکوۃ شریف)

"علماء، انبیاء کے وارث ہیں۔"

یہاں عالم سے مراد محض درسی علم کے حامل نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو علمِ حقیقی سے آراستہ ہوں، اور حقیقی علم وہ ہے جو دین کے تینوں اجزاء (اسلام، ایمان اور احسان) کا مرکب ہو، انسان کو اپنی پہچان کرائے اور خالقِ حقیقی سے ملائے۔مگر یاد رہے کہ اس علم کا

حصول عشق کی جوت جگائے بغیر ممکن نہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی ”سِرالاَسرار“ میں حدیثِ مبارکہ ..... ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے“ کی وضاحت میں علم کو محض درسی علم نہیں بلکہ علمِ معرفت اور قربِ الٰہی قرار دیتے ہیں۔

علم مشکل باتوں کو سہولت اور آسان پیرائے میں بیان کرنے کا نام ہے۔ یہ معرفتِ الٰہی کے اوّلین درجوں میں سے ایک ہے۔ جذب والے فقیر علم والے عارفوں سے درجہ میں علم کے سبب ہی کم ہیں۔ علم کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ طالبِ علم اگر مراد نہ پا سکے تو بھی اجر کا مستحق ٹھہرتا ہے جیسا کہ طبرانی وغیرہ میں بالتحقیق آیا ہے:

مَنْ طَلَبَ عِلْمًا فَادْرَكَهُ كَانَ لَهُ كِفْلَانِ مِنَ الْاَجْر،
فَاِنْ لَمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهُ كِفْلٌ مِنَ الْاَجْر

”جو شخص علم کی تلاش میں نکلے اور اسے حاصل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو اجر لکھ دیتا ہے اور جو شخص علم کا جویا ہو مگر اس کو حاصل نہ کر سکے ربِّ کائنات اس کے لیے ایک اجر لکھ دیتا ہے۔“

پیغمبرِ برحق حضرت یحییٰؑ نے فقیر کے آئندگان کو دُعاؤں سے نوازتے ہوئے ملائکہ کے ساتھ شاملِ تسبیح ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ عظمت وجلال کی فضا میں حق سبحانہ تعالیٰ کا ذکر کیسی کیف آگیں کیفیت رکھتا ہے۔ یوں محسوس ہوا کہ بدن نام کی کوئی شے اس پل موجود نہیں، بس روح کا ایک ہنڈولہ ہے جو وردِ اسمِ ذات کے ساتھ پورے فلک میں گردش کر رہا ہے اور نجوم ایک خاص لَے میں شریکِ ذکر ہیں۔ مشاہدہ کیا کہ ہر جانب اسمِ شافی کی لہریں موجزن ہیں اور 'ھوالشافی' اور 'اللہ الشافی' کی تجلیات ہر غم کو سینے سے دھو رہی ہیں۔ فقیر کو بتایا گیا کہ اسمِ ذات

ہی میں اسمِ شافی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کیا جانے والا ہر کام نہ صرف آلودگی سے پاک اور آسودگی کا باعث ہوتا ہے بلکہ بسم اللہ شریف کا وِرد ہر جسمانی و روحانی رنج و مرض کا مداوا بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ جب ہم 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کی تلاوت کرتے ہیں تو گواہی دیتے ہیں کہ وہ رحمٰن و رحیم ہی ہر کام میں برکت عطا کرنے اور آلام سے بچانے والا ہے۔ یہاں یہ اقرار بھی مخفی ہے کہ بے شک شِفا من جانب اللہ ہے۔

پانچویں فلک کی نوری حالتوں کا احاطہ الفاظ نہیں کر سکتے۔ یہاں مادے کا تصور مفقود اور ہیچ ہے۔ سَجل مناظر میں بوجھ اور گرانی کا احساس تک نہیں ہوتا حال آنکہ طمطراق اور دبدبہ گرانی پیدا کرتا ہے۔

مسافر کا اگلا پڑاؤ فلکِ ششم تھا۔ یہاں کے ملائکہ سارے اسماء وصفاتِ الٰہی ونبویؐ کے موتیوں کی تسبیح میں مشغول ہیں جن کی رنگینی و رعنائی دلوں کو مسخر کرتی ہے۔ آواز آئی کہ اے مسافر موتی چُن، جتنے چُن سکتا ہے۔ عاجز نے حسبِ ارشاد بساط بھر خیرات لی تو دیکھا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ رونق افزا ہیں اور ایک مستیٔ ازلی سے میری جانب ملتفت ہیں۔ فرمایا...... "آپ مجھے پہچانتے ہیں؟" الحمد للہ عطائے محمدی ﷺ کے سبب فقیر خبردار تھا اور صاحبِ 'لن ترانی' کی شان جانتا تھا۔ سلام کیا اور عرض کی ......... "اے رَبِ اَرِنِــــی کہنے والے! آپ ہی تو فرعونیت کو خاک میں ملانے اور اللہ کے حکم سے ربوبیت کے اسرار وانوار کے رمز شناس ہیں۔ آپ ہی کا فیض فلکِ سوم سے ایک ذاکر کے دل کو منور کرتا ہے۔" یہ سننا تھا کہ کلیم اللہ کے چہرۂ مقدس پر الحمد کا نور فزوں ہو گیا اور ارشاد کیا"....پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے محبوب ﷺ کے امتیوں کو ایسے مقامات عطا فرمائے جن کا گمان بھی بنی اسرائیل کے پاکیزہ نفوس نہیں کر سکتے۔"

عرض کیا...... ”اے مرتبۂ حشم والی پاکیزہ ہستی، حدیثِ خاتم الانبیاءؐ اس ضمن میں حجت ہے اور بے شک آپ کی گواہی معتبر ترین۔“

دیکھا کہ آپؑ کا دستِ مبارکہ بلند ہوا اور ایک عصا نکل کر یوں میری جانب آیا گویا ہوا میں تیر رہا ہو۔ جب عصا میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھنے لگا تو سرکارِ دو عالم ﷺ کی آوازِ مبارکہ زینت گوش ہوئی ”بیٹے اسے تھام لو۔“ میں نے تعمیل کی تو حضرت موسیٰؑ کے رُوئے مبارک پر تبسم کی لکیر ابھری اور فرمایا ”یہ دلیل اور زُہد کا عصا ہے۔ اسے رکھیے اور منکرین کی سرکوبی کیجیے۔“ میں نے عرض کی..... ”حضرتؑ! عشقِ مصطفیٰؐ ہر حالت میں حاجت روا ہے اور باری تعالیٰ کا احسان ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کا ادنیٰ اُمتی ہوں البتہ عطائے ربانی اور فرمانِ حضورؐ پر سر جھکاتے ہوئے شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔“ اس پر آپؑ نے فرمایا...... ”امام الانبیاء ﷺ کے فقیروں کا استغناء اور قناعت ہی اُمتِ مسلمہ کا سرمایہ ہے۔“

یہ فلک سارے افلاک میں دوسرے مرتبہ پر پیدا کیا گیا۔ یہی مقامِ میکائیل ہے اور وہ یہاں سب فرشتوں کے سردار ہیں۔ یہ ملائکہ حکمِ الٰہی سے انبیاء اور اولیاء کی منازل کے ذمہ دار ہیں اور ان کے مراتب میں ترقی کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان فرشتوں میں رحمت، اسراریت، رفعِ کفر، شفا اور فروغِ دُعا کی صفات ہیں جو اہلِ زمین کے لیے وجہِ فضل و کرم ہیں۔ یہاں بھی ملاحظہ کیا کہ ملائکہ اتنی شکلوں میں ہیں جن کا شمار ممکن ہی نہیں۔ ربِّ قادر و قدیر نے انھیں یوں خلق فرمایا کہ فہم انسانی تعبیر و تفسیر سے عاجز ہے، اللہ اکبر۔ بعض تو ایسے ہیں کہ انھیں آتش اور یخ بستہ پانی سے پیدا کیا گیا۔ شاید پڑھنے والا اسے اجتماعِ ضدین جان کر ظن و گمان میں پڑ جائے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ امرِ الٰہی ہے کہ آبِ یخ زدہ اپنی حد سے متجاوز ہو کر رواں نہیں ہو

سکتا اور اسی ہیئت پر برقرار رہتا ہے جس پر خلق کیا گیا۔ اسی طرح آتش کا جوہر جلانا ہے لیکن اسی کیفیت میں برقرار ہے جو اسے امر کی گئی۔ سالک دیکھے گا کہ کیسے نصف حصہ آتش اور نصف حصہ یخ تعینات میں ہے۔ بہت سے ایسے ہیں کہ حیوانات و طیور کی صورتوں میں ہیں۔ یہ دنیاوی اعتبار سے کم مرتبہ لوگوں کی دلجوئی پہ مامور ہیں اور شکستگی دور کر کے عبادت و ریاضت کا شوق دلوں میں ڈالتے ہیں۔ غرض یہاں کا ہر مقام اللہ اکبر، سبحان اللہ اور نغمۂ توحید کا مظہر ہے۔

عاجز نے حضرت میکائیلؑ کے ساتھ مل کر جناب رسالت مآبؐ پر درود بھیجا۔ آپؐ نے فرمایا...... "یہ فلک ساتویں کے سوا سب پر محیط ہے اور مقامِ براقِ مصطفےٰ ﷺ ہے مگر وہ یہاں کی مخلوق نہیں البتہ باقی تمام انبیاءؑ کی سواریاں اسی فلک سے ہیں...... آپ کے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ بھی جب یہاں تشریف لائے تھے تو دُرود شریف کی ایسی ہی محفل سجی تھی۔ آپ کو نوید ہو کہ اس سے پہلے یہ مرتبہ کسی باپ بیٹے کو نصیب نہیں ہوا۔" میں نے عرض کی "اے پروردگار کی برگزیدہ مخلوق، یہ سب اللہ کا کرم اور حضورؐ کی عطا و رحمت ہے ورنہ زہد و عبادت میں کتنے ہیں کہ افضل و محترم ہیں۔"

ساتویں فلک کو باری تعالیٰ نے عقل کے نور سے خلق فرمایا اور وہ عقلِ اوّل ہے جو تمام عقول پر حاوی ہے۔ یہ فلک تمام عالم اور موجودات سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ یہاں زائر نے ان نجوم کا بھی مشاہدہ کیا جن کی شناخت ہر ایک نہیں کر سکتا اور چشمِ ظاہر بیں پر ان کی رفتار نہیں کھلتی۔ یہاں کے ایک گوشے کا منظر بہت مہیب، خوفناک اور عبرتناک ہے۔ یہ ارواحِ رذیلہ کی قیام گاہ ہے۔ اس مقام پر ہر جانب شبِ دیجور کا گمان ہوتا ہے جو سالک کے لیے کنایہ ہے کہ عقلِ کُل اور فہمِ مکمل کی پہچان غیر ممکن ہے۔ حضرت جبریلِ امینؑ، حضرت عزرائیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت اسرافیلؑ اور

رتبے میں فضیلت و شرف کے حامل دیگر ملائکہ اسی فلک پر رہتے ہوئے اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہیں۔ یہاں ایک اور عالی مرتبت فرشتے کا دیدار بھی نصیب ہوا۔ میں نے انھیں دیکھ کر سورۃ اخلاص تلاوت کی اور دُرود شریف ہدیہ کر کے عرض گزار ہوا .....

"شکر ہے اللہ کا جس نے نبیٔ کریمؐ کے صدقے تمام جہانوں کو خلق کیا اور مبارک ہے وہ صلب جس میں آپؐ کا نُور رکھا گیا تاکہ آپؐ عالمِ انسانی میں تشریف لائیں۔ پاک ہے وہ باپ جو حاملِ نورِ محمدیؐ تھا اور یقیناً طاہرہ ہے وہ بی بی جس کا شکم جوہرِ مصطفےٰ ﷺ سنبھالے ہوئے تھا۔" اللہ اللہ، یہ سننا تھا کہ منتظم فرشتوں کے سُرخیل حضرت جبرائیلؑ آگے بڑھے اور فرمایا ..... "یہ عبداللہ ہیں، عبادات کے لحاظ سے ملائکہ میں سب پر مقدم۔" میں نے ایمانِ مفصل اور ایمانِ مجمل پڑھا تو حضرت عبدؑاللہ نے فرمایا ...... "اسماء کی مماثلت لازمی طور پر امرِ واقعہ کی طرف نہیں جاتی۔ اتنا ہے کہ پروردگارِ عالم نے اپنے محبوب ﷺ کے صدقے ہی مجھے یہ مبارک نام عطا کیا ہے۔ آپ کی نسبت کو سلام ہو کہ آپ نے اِذنِ عشق کے باعث یہ معرفت حاصل کی۔"

یہ فلک کرسیٔ خلیل اللہ کا حامل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ یہیں رونق آرا ہیں۔ فقیر آپؑ کی خدمت میں پہنچا اور سلام بھیجا۔ آپؑ نے جواب سے نوازا، پھر خاتم الانبیا ﷺ پر دُرود پڑھ کر فرمایا ..... "بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری دُعا کو مُستجاب کیا اور حضرت محمد ﷺ کو میری آل میں رکھ کر لطف و احسان کی حد کر دی۔ جب سے یہاں ہوں اسی ایک نعمت کا شکر کیے جاتا ہوں، دیگر احسانات کا شکر یہ جانے کب ادا ہو۔" عرض کیا ..... "اے معمارِ کعبۃ اللہ! پروردگار نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی قبول فرماتے ہوئے دُنبہ بھیج دیا مگر قربانی کا التواء منظور نہ کیا۔ یہ رُتبۂ بلند بھی آپ ہی

کو نصیب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت فاطمۃ الزہرؓا کے فرزند حضرت امام حسینؓ پر قربانی تمام کردی۔" اتنا کہنا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی مُبارک آنکھوں میں اشک چمکنے لگے۔ فرمایا..... " ظالموں کا یومِ حساب دور نہیں۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ اس ایک کلمۂ خیر و خلوص کی برکت سے آپ کے متوسّل کشت و فساد سے محفوظ رہیں گے اور باطل آپ پر غالب نہیں آسکے گا۔" اس کے بعد خلیل اللہ نے ایک ریزۂ سنگ عطا کیا اور فرمایا " یہ وہ مبارک پتھر ہے جو حجرِ اسود کے بعد بنیادِ کعبہ میں نصب ہوا۔ باقی حصہ محفوظ ہے جبکہ یہ آپ کے لیے صدیوں سے رکھا ہوا تھا۔"

میں گریہ کناں تھا اور حمد و ثنا کے پھول میرے ہونٹوں سے جھڑ رہے تھے۔ شکریہ کے ساتھ یہ سوغات لی اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے عرض گزار ہوا..... " بے شک آپؑ کنیزوں اور غلاموں کو عزت دینے والے ہیں۔ آپؑ نے حضرت حاجرہؑ کی حیثیت کا خیال کیا اور انھیں تکریم و محبت دی۔ اللہ جسے چاہے عزت و توقیر عطا کرتا ہے۔ اس نے صفا و مروہ پر اس پاک بی بی کی تلاشِ آب میں بے چینی سے دوڑ دھوپ اتنی پسند فرمائی کہ سعی حج کا اہم ترین جزو قرار پائی۔ بے شک سعی کو پیغمبروں نے سنت بنایا اور یہ ذکر کی عملی صورت ہے۔ جیسے تحصیلِ علم، حصولِ رزقِ حلال اور ترویجِ دین۔" اسی دوران فقیر کے دل میں ترمذی شریف کی ایک حدیثِ قدسی روشن ہوگئی:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ تَعَالٰی مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ وَ ذِکْرِیْ عَنْ مَسْاَلَتِیْ، اَعْطَیْتُهُ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ، وَ فَضْلُ کَلَامِ اللّٰہِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِهٖ

" (حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ) رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیثِ قدسی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " جس شخص کو قرآن شریف کی

مصروفیت کی وجہ سے ذکر کرنے اور دُعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔ اللہ کے کلام کو سارے کلاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسے خود اللہ کو تمام مخلوق پر فضیلت ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ قول و فعل اور نیّت کے حوالے سے ذکر کی جن سماجی اقسام پر میں سوچتا ہوں وہ بھی مستحسن کام ہے۔ آپؓ نے فرمایا ..... "بے شک کوئی بھی اچھا عمل جس سے انسانیت کا بھلا ہو اور باری تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب بنے، ذکر ہی کے زمرے میں آتا ہے لیکن تنہائی میں بیٹھ کر ذکرِ اسمِ ذات کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مبارک ہو کہ آپ نے اس باب میں باریک نکات کو جان لیا اور حمدِ باری تعالیٰ کی نئی جہت پیدا کی۔" میں نے گزارش کی ....... "وہ ذات ہر پہلو اور تعریف سے ورا ہے بس اتنا ہے کہ فقیر کی ایجادِ طبع بھی اُسی کی دین اور عطا ہے۔"

راقم نے افلاک اور اس کے آسمانوں کا رقبہ اس لیے بیان نہیں کیا کہ ہر فلک کی مسافت برسوں قرنوں کو محیط ہے اور صرف پڑھنے سُننے سے اُن کا ارض و بسط ادراک میں نہیں سما سکتا۔ اگرچہ چند کتبِ عالیہ میں محیط و مُسافت کا تذکرہ میکانکی پیمائش کی طرح کیا گیا ہے تاہم فقیر کا خیال ہے کہ بس ایمانِ کامل ہی اس باب میں رہنمائی کر سکتا ہے۔ فقیر نے افلاک پر جو کچھ بھی ملاحظہ کیا اس میں نظم اور ترتیب کا عنصر ہر حال میں دامن کش اور دلچسپ تھا۔ دیکھا کہ نُوری مشعل برداروں میں سے ایک فرشتہ میری جانب بڑھ رہا ہے اور اس نے اسمِ ذات بلند کر رکھا ہے۔ حکمِ خلیلؑ کی تعمیل میں اپنے ہاتھ اسمِ پاک پر ٹکا دیے اور اسے رگ و پے میں اترتا محسوس کیا حالانکہ اس لمحے بدنی احساس محو تھا۔ یہ کیفیت الفاظ کے احاطے میں نہیں آ سکتی۔ فقیر نے مشاہدہ کیا کہ

سدرۃ المنتہیٰ میں ہر سو تجلیات وانوار ہیں اور لاشریک کے حکم سے وہاں کی نورانی مخلوق سربسجود ہے۔ کچھ قیام میں ہیں، کچھ رکوع میں اور اکثر ایسے ہیں کہ جذب ان کا بیان کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔ بادۂ توحید کا نشہ ہے کہ بے اختیاری طاری کر دیتا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ سردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی نوری مشعلیں ہیں جن پر اسمائے باری تعالیٰ ایسے تابندہ ہیں کہ صفتوں کی چمک کے اظہار میں ہمارے لفظ ماند پڑ جائیں۔ ان میں سے کچھ کرّوبین کے سرخیل ہیں۔ پھر ثلاثہ ہیں جو پچھلے تمام سرداروں سے افضل ہیں، ان کا مرتبہ اور تمکنت سب سے بڑھ کر ہے۔

الغرض ہفت افلاک مشاہدات کا عجائب خانہ ہیں۔ مسافر رخصت ہوا اور سارے عجائب دیکھے جو بیان وگمان سے بے نیاز ہیں اور اسی کی گواہی دیتے ہیں جو اطلس، کواکب، ہباء اور اعلیٰ افلاک کا تخلیق کار ہے۔ تاہم یہ صرف نبیٔ کریم ﷺ کا مرتبہ وعظمت ہے کہ معراج کی شب مہمانِ باری تعالیٰ ہوئے اور وہ سب کچھ ملاحظہ فرمایا جو آپؐ کے علاوہ کسی اور پیغمبر یا انسان کی رسائی میں قیامت تک نہیں آ سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ ..... ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے منصبِ جلیلہ اور مقامِ محمود سے سرفراز ہوئے کہ اللہ کریم اپنے وعدے کا آپ محافظ ہے۔

تمام بحور، زمینوں اور آسمانوں کے حجابات خاکسار کے سامنے اٹھ گئے اور زائر نے بقدرِ شوق کمالِ قدرتِ الٰہی کا جلوہ کیا۔ مشاہدات میں اس درجہ ترقی عطا ہوئی کہ اسرار کھلتے گئے اور مسافر بہر گام سجدوں کے نشانِ طاعت ثبت کرتا گیا۔ دریائے رحمت جوش میں ہو تو پردے سرک جاتے ہیں اور فنافی اللہ کی منزل آغاز ہو جاتی ہے۔ علم التوحید سے عین التوحید اور حق التوحید تک ہر مسافت سبک رفتاری سے طے ہوتی ہے۔ فقیر کیا عرض کرے کہ انوار و اکرام کیسے چھم چھم برستے رہے اور قلبِ درویش پر کون کون سی تجلّی کا ظہور رہا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھ ایسا ذرّۂ حقیر نسبتِ حضورؐ کے صدقے رشکِ آفتاب کر دیا گیا۔ گویا

ع عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

جدھر جاتا قدسی حُسنِ سلوک سے پیش آتے۔ میں اسمِ ذات اور درودِ پاک پڑھتا جاتا اور نشۂ احمدیؐ میں سرشار مظاہرِ قدرت میں نظر کر کے سبحان اللہ کہتا جاتا۔ زمین و آسمان اور دریاؤں کے عجائبات دیکھ لیے، انبیاء و اصحاب اور اولیاء و علماء سے ملاقاتیں ہو گئیں لیکن قلب و نظر بارگاہِ حضورؐ میں باریابی کے لیے بے چین و مضطرب تھے۔ میرے شوق نے پذیرائی پائی اور دربارِ رسالتؐ میں حاضری کا پروانہ عطا ہوا۔

وہ عجیب وقت تھا۔ فقیر کی آنکھوں میں توحیدِ الٰہی اور حقیقتِ محمدیہ ﷺ کی دو شمعیں روشن تھیں جن سے مہر و ماہ شرماتے تھے۔ ہر جانب سے مُبارک، مُبارک کی پرنور صدائیں بلند ہوئیں اور میں نے خدمتِ اقدسؐ میں باریاب ہوتے ہی سر اُن مبارک

قدموں میں رکھ دیا جن کے نعلین عرش کا تاج ہیں۔ یہ تو اویسیوں اور کمالیوں کی جبلّت ہے کہ جونہی سرکار ﷺ کا نام نامی آیا وفورِ عشق میں سب کچھ بھلا کر روح کی مہمیز سے درِ دولت پہ جا پہنچے۔ حضورؐ نے سر پر دستِ شفقت رکھا اور سفر کی کیفیت دریافت فرمائی۔

عرض کی ..... ''یا رسول اللہ ﷺ! عاشق کا سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ اسے آپ ﷺ کے پائے عرش مقام میں جگہ نصیب ہو اور وہ ساری عمر اسی بوسہ گاہ میں گزار دے۔ فقیر کو آپؐ کا ادنیٰ امّتی ہونے کے ناطے وہ کچھ عطا ہوا جس کے بیان کی مجال نہیں لیکن دربارِ اقدسؐ کی جاروب کشی سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہیں۔'' میرا شوق ملاحظہ فرما کر سرکارؐ نے اکابرینِ سلسلۂ عالیہ کی جانب نگاہ فرمائی۔ مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ آگے تشریف لائے اور مجھے سینے سے لگا کر فرمایا..... ''بے شک اس روحانی سفر کے تمام انتظامات دربارِ اقدسؐ سے پہلے ہی طے پا چکے تھے اور حضورؐ کی ہدایت پر ہی عجائبات سے آپ کے تعارف کا اہتمام کیا گیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ہر مقام پر عالمِ اسلام کو پیشِ نظر رکھا اور اُمتِ مسلمہ کے مسائل ہر آن آپ کے سامنے رہے۔ یوں ایک امتحان بھی ہو گیا۔ جن حضرات کو آپ نے ذمّہ داریاں سونپی تھیں انھوں نے قابلِ قدر کام سرانجام دیا ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب پاکستان اور دیگر خطوں میں دینِ اسلام کو مزید ترقی ملے گی۔'' حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے بارک اللہ کہہ کر نوازا تو نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا ''بیٹے! اللہ نے آپ کی ادائیگیٔ حج کو نہ صرف شرفِ قبولیت بخشا بلکہ اُس سال آپ ''رئیس الحجاج'' بھی قرار دیے گئے۔ دورانِ حج والدہ کا خیال رکھنے پر اللہ نے بطور انعام حجاج کے دلوں میں آپ کی عقیدت راسخ کر دی۔ قیامِ منیٰ کے دوران لوگوں کا آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر اصرار اور دعاؤں کی درخواست اس سلسلہ میں ایک مثال ہے۔ کیا واپسی پر

بھی اس سعادت کی گواہیاں نہیں ملیں؟'' میں نے عرض کی...... ''یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، یہ سب آپؐ سے نسبت کا شرف ہے۔''

اس دوران حضراتِ حسنین کریمینؓ نے اپنے مبارک ہاتھ میرے شانوں پر رکھے۔ حضرت امام عالی مقامؓ نے فرمایا...... ''دس محرم کو آپ کی محفل میں شریک تمام لوگوں کی مغفرت کر دی گئی ہے اور آئندہ جو بھی اس محفل میں شامل ہو گا اس کی شفاعت کی ذمہ داری نبی کریم ﷺ کی اجازت سے میں اٹھاتا ہوں۔'' میں نے جھک کر مظلومِ کربلاؓ کے مبارک قدموں کو بوسہ دیا۔ (تاہم یاد رہے کہ ایسی کسی محفل میں شرکت یقیناً باعثِ اعزاز ہے لیکن اس مقام پر مستقلاً فائز رہنے کے لئے آپؓ کا فلسفۂ حیات اپنے اندر راسخ کرنا اور اس پر دائم کاربند رہنا بنیادی شرط ہے۔)

فقیر عطاؤں کی بارش میں نہا رہا تھا۔ ایک ابرِ نور تھا کہ چھاجوں برس رہا تھا۔ ایسے میں فخرِ دو عالم، سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا..... ''بیٹے کچھ خصوصی اکرام ہیں جنھیں آپ کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ان خزانوں میں سے کسی کو کچھ عطا نہیں ہوا۔ ہم نے آپ کے لیے 'مرجَ البحرین' کو مراقبۂ خصوصی قرار دیا ہے۔ جیسے 'سلطانُ الاذکار' میں تمام لطائف ایک ہو جاتے ہیں ایسے ہی یہ مراقبہ تمام مراقبات کی یکجائی کا مقام ہے۔ جب آپ کسی کے سامنے مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ o بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o کی تلاوت کریں گے تو اسے آپ کی معیّت میں جلوۂ بحرین ہو گا۔ جسے چاہیں اس مراقبے میں مقامِ اتصال کا دیدار کرا سکتے ہیں۔ یہ وہ نسبت ہے جو پہلے کسی کو ملی نہ آئندہ عطا کی جائے گی۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ ایک مرتبہ راقم کو اس مراقبے کی تعلیم دیں۔ اللہ اکبر، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت امام حسنؓ اور

حضرت امام حسینؓ کو بھی ساتھ لیا۔ فقیر یہ مقام پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن ان پاکیزہ نفوس کی موجودگی میں مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ، برزخ اور لُؤْلُؤُ وَالْمَرْجَان کے مزید اسرار کھلے تو یہ احساس اور بھی راسخ ہو گیا کہ یادِ الٰہی سے بہرہ مند، حُبِ رسولؐ سے لبریز اور مودتِ اہلِ بیتؓ کا حامل ہی مسافتِ عشق میں بامُراد ہو سکتا ہے۔ مراقبے کے بعد مولائے کائناتؓ نے مَرج البحرین کے حوالے سے مزید نکتے تعلیم فرمائے۔ دربارِ اقدسؐ میں پھر واپسی ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا..... ''بیٹے اس مراقبے میں تمام مراقبات کے ارتباط کے باعث آپ کے ساتھیوں کو مظاہر کی اصل کا حال بھی معلوم ہو گا لیکن بہتر ہے کہ ہر کسی پر عطا کا یہ در وا نہ کیا جائے۔'' فقیر نے ایک بار پھر ثنائے الٰہی کے بعد دُرود شریف کا نذرانہ پیش کیا۔ دریائے رحمت جوش میں تھا۔ سرکارؐ نے مزید فرمایا...... ''جس طرح کمال صاحب کو درود شریف کی نسبت عطا ہوئی تھی اسی طرح آپ کو بسم اللہ شریف کی نسبت سے نوازا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ اس کے ورد کے حوالے سے آپ کو وہی انفرادیت اور اختصاص حاصل ہو گا جو درود شریف کے حوالے سے آپ کے والدِ گرامی اور شیخِ مکرّم کو۔'' (میرے حضرت جیؒ اس منفرد اعزاز کے حوالے سے ''حالِ سفر'' صفحہ (۱۱۶) پر رقمطراز ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''--- تم نے اُمتِ محمدیہؐ کے کثرت سے درود پڑھنے والے پہلے سو اشخاص میں شامل ہونے کی دُعا کی تھی --- مگر اللہ کریم نے اس لحاظ سے تمہیں ساری امت میں اوّل کر دیا۔ سو درود شریف کی تعداد کے لحاظ سے کوئی بھی تمہارا مثیل نہیں۔)

درودِ پاک اور بسم اللہ شریف کے سلسلۂ عالیہ میں اتصال سے گویا ''نورٌ علیٰ نور'' کا سرمدی کیف بول اٹھا۔ دست بستہ عرض کی .... ''یا رسولؐ اللہ، غلام کا سب سے بڑا اعزاز تو اپنے حضرت جی کی پیروی میں وردِ درود شریف کے ذریعے آپؐ کی محبت کا حصول ہے۔'' یہ سُن کر نبی کریمؐ نے تبسم فرماتے ہوئے ارشاد کیا ''بیٹے آپ جانتے

ہیں کہ کمال صاحب کو درود شریف کے ساتھ ساتھ بسم اللہ شریف اور کلمہ طیبہ کے خزانوں کی کنجیاں بھی عطا کی گئی تھیں۔ درود شریف اُن کا مقدر تھا لیکن بسم اللہ شریف کے ورد کو اوجِ کمال تک پہنچانے کے لیے آپ کا انتخاب دُعائے کمال ہی کا نتیجہ ہے۔ اطمینان رکھیں، بسم اللہ شریف کی تعداد کے برابر آپ کا درود شریف بھی قبول کیا جائے گا۔" میں نے متوسلین کے لیے رہنمائی چاہی تو سرکارؐ نے فرمایا...... "متوسلینِ سلسلہ اپنی طبعی مناسبت سے دونوں یا کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔" مزید ارشاد ہوا "بیٹے! بسم اللہ شریف قرآنِ کریم کی رونق، خلاصہ اور کلیدِ معرفت ہے۔ یہ انسان کو مظاہرِ قدرت کے عرفان، ذات وصفات کے ادراک اور غور وفکر پر راغب کرتی ہے۔ یہ ربِ کریم کا محبوب ترین وظیفہ اور میرا پسندیدہ ترین عمل ہے۔ اس میں اللہ کی رحمت اور رحم مل کر جامعیت کو واضح کرتے ہیں۔ اسمِ تعالیٰ میں الوہیت اور الرحمٰن الرحیم میں مقامِ ربوبیت کا ذکر ہے یعنی رحمت اور اس کے تمام پہلو بسم اللہ شریف میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔"

تفسیرِ کبیر، روح المعانی وغیرہم میں حق تعالیٰ کے تین ہزار اسماء کے حوالے سے صراحتاً درج ہے کہ ان میں سے ایک ہزار ملائکہ کو معلوم ہیں اور ایک ہزار کا علم صرف انبیاء کو نصیب ہوا جبکہ بقیہ ایک ہزار میں سے تین تین سو بالترتیب توریت، انجیل اور زبور میں مرقوم ہیں۔ قرآنِ کریم چونکہ آسمانی کتب وصحائف کا نچوڑ ہے، اس لیے اس میں ننانوے جامع ترین اسماء کا گلدستہ پیش کیا گیا جبکہ ایک نام صرف اللہ خود ہی جانتا ہے لیکن بسم اللہ شریف کے تین الفاظ اللہ، رحمٰن اور رحیم میں مذکورہ تین ہزار اسمائے الٰہی کے معانی اور اسرار ورموز کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ سو جس نے بسم اللہ شریف کا ورد کیا گویا اس نے ربِ کریم کو تین ہزار اسماء کے ساتھ یاد کیا۔

فقیر بسم اللہ شریف کی فضیلت سے کسی حد تک پہلے سے آگاہ تھا اور ایک مخصوص تعداد کا ورد عرصۂ دراز سے معمولات میں شامل بھی تھا لیکن آپؐ کی زبانِ مبارکہ سے اس منفرد اور عظیم الشان اعزاز کے بارے میں سُن کر اپنے بخت پہ رشک آنے لگا۔ عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ خاکسار ہر نسبت کو آپؐ کے حوالے سے عزیز از جان رکھتا ہے۔" میری عرض پر تمام اصحابِ کرامؓ نے فرمایا ....... "بے شک، اللہ نے ہر شے اپنے حبیبؐ کے صدقے میں پیدا کی اور تمام نسبتیں آپؐ ہی کے لیے ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ رحمۃ اللعالمینؐ مصلّے پر تشریف لے گئے اور ایک طویل سجدہ فرمایا۔ کافی دیر بعد آپؐ نے سرِ انور اٹھایا اور دعا کے بعد میری جانب نگاہِ کرم فرمائی اور ارشاد ہوا:

۱۔ "بیٹے! آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا روزِ محشر میرے قریب ہوگا۔

۲۔ آئندہ ہر سالک کی ولایت آپ کی سفارش کی مرہونِ منت ہوگی۔

۳۔ بسم اللہ شریف کا ورد کرنے والا قیامت کے دن آپ کے ساتھ ہوگا۔

۴۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں کو لیلۃ القدر کی برکات سے نوازا جائے گا۔

۵۔ آپ سے محبت رکھنے والے کو میری محبت حاصل ہوگی۔

۶۔ ولایت آپ کی اولاد میں کبھی ختم نہیں کی جائے گی۔

۷۔ آپ عبدِ ثانی اور کمالِ ثانی کے القاب سے مقبولِ خلائق رہیں گے۔

۸۔ آپ کے ہاتھ پر اسمِ ذات کا نقش وقت گزرنے کے ساتھ مزید گہرا ہوگا۔

۹۔ سلسلۂ اویسیہ کمالیہ آپ کے ذریعے ہمیشہ شاداب رہے گا۔"

یہاں نبیٔ کریمؐ نے خاموشی اختیار فرمائی تو حضرت عمر فاروقؓ نے مبارک باد سے نوازتے ہوئے فرمایا..... "آپ ان انعامات کی خوشی میں وہ کلام سنائیں جو دورانِ حج

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں آپ کے ذہن پر القا ہوا تھا۔" میں نے دیکھا کہ نبی ؐ کریم سرورِ دو عالمؐ اجازت مرحمت فرما رہے ہیں تو اپنی اویسی کمالی لے میں حمد سرا ہوا:

ہر سُو سناٹا گونجتا ہے آخر ہے شب میں حاضر ہوں
میں لاج کا مارا کیا آتا رحمت کے سبب میں حاضر ہوں

لبیک لبوں پر جاری ہے اک رعب دلوں پر طاری ہے
اب کیسی پردہ داری ہے اے میرے رَب میں حاضر ہوں

جو آیا ابر میں جھوم گیا کوئی بھی نہیں محروم گیا
مجھ پر بھی کرم کی بارش ہو پھر جانے کب میں حاضر ہوں

سب اپنی اپنی بولیوں میں نذرانے لے کر آئے ہیں
آوازیں ہی آوازیں ہیں اور مہر بہ لب میں حاضر ہوں

دنیا کی حرص و ہوس نے مجھے اک عمر یہاں سے دور رکھا
دامانِ شفاعت مل جائے اے آقاؐ اب میں حاضر ہوں

کتنے ہیں جنھیں خود مولا نے خدمت کے لیے بلوایا ہے
میں تو ہوں غلامِ کوئے نبیؐ سو حسبِ طلب میں حاضر ہوں

سنتا تھا فرشتے آتے ہیں اس در کی گدائی کرنے کو
اے شافعِ دیںؐ، اے نورِ مبیںؐ، اے شاہِ عربؐ میں حاضر ہوں

دہلیز پہ صدیاں کٹتی ہیں تب جا کے حضوری ہوتی ہے
میں بخت پہ نازاں ہوں کہ ہے یہ بزمِ ادب میں حاضر ہوں

میں گوشہٗ باغ سے آیا ہوں پھولوں کا دستہ لایا ہوں
دربارِ ادب سے حکم جو ہو قدموں میں تب میں حاضر ہوں

تابش درِ اقدسؐ پر آ کر مخلوق سلامی دیتی تھی
اک عمر ترستے گزری تھی کتنا ہے عجب میں حاضر ہوں

اس دوران احسنت، مرحبا کے توصیفی الفاظ گونجتے رہے۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت امامِ حسنؓ کو اشارہ کیا تو انھوں نے چھوٹی سی ایک تھیلی حضورؐ کے دستِ مبارک میں تھمادی جسے آپؐ نے سامنے پڑے طشت میں الٹا دیا۔ فقیر نے دیکھا کہ وہ تمام موتی ہیں اور ہر ایک پر کچھ نہ کچھ درج ہے۔ نبیٔ کریمؐ نے وہ طشت میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا..... "بیٹے، یاد کیجیے یہ وہ موتی ہیں جو آپ کو آسمان پر چننے کے لیے کہا گیا تھا۔ ان موتیوں پر ایسے اسماء وصفات درج ہیں جنہیں مشترکہ بھی کہتے ہیں اور کمالیہ بھی۔ اگرچہ یہ نام نئے نہیں لیکن اس ترتیب سے آج تک بطور وظیفہ ان کی اجازت کسی کو عطا نہیں کی گئی۔ سلسلہ اویسیہ کمالیہ کی خصوصی نسبت رکھنے اور پوری لگن کے ساتھ حسبِ حکم یہ موتی چننے کے صلے میں آج سے ان اسماء کو آپ کا وظیفہ قرار دیا جاتا ہے۔ آپ روزانہ کم از کم پانچ بار اس کا ورد کرلیا کریں۔"

حضور ﷺ کے حکم پر حضرت علی المرتضیٰؓ اور حسنینِ کریمینؓ نے مجھے یہ وظیفہ تعلیم فرمایا۔ یوں کہ پہلے یہ تینوں ہستیاں پڑھتی تھیں اور پھر یہ طالب اسے آموختے کی طرح دہراتا تھا۔ وظیفہٗ اویسیہ کمالیہ یوں ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ

یَااَللّٰہُ یَا رَحِیۡمُ یَامُحَمَّدُ یَا کَرِیۡمُ

یَااَللّٰہُ یَا سَلَامُ یَامُحَمَّدُ یَا اِمَامُ

یَااَللّٰہُ یَا سَمِیۡعُ یَامُحَمَّدُ یَا شَفِیۡعُ

یَااَللّٰہُ یَا بَصِیۡرُ یَامُحَمَّدُ یَا مُنِیۡرُ

یَااَللّٰہُ یَا غَفُوۡرُ یَامُحَمَّدُ یَا شَکُوۡرُ

یَااَللّٰہُ یَا حَسِیۡبُ یَامُحَمَّدُ یَا حَبِیۡبُ

یَااَللّٰہُ یَا مَجِیۡدُ یَامُحَمَّدُ یَا رَشِیۡدُ

یَااَللّٰہُ یَا وَکِیۡلُ یَامُحَمَّدُ یَا خَلِیۡلُ

یَااَللّٰہُ یَا مَتِیۡنُ یَامُحَمَّدُ یَا مُبِیۡنُ

یَااَللّٰہُ یَا وَلِیُّ یَامُحَمَّدُ یَا نَبِیُّ

یَا اَرۡحَمَ الرّٰحِمِیۡنَ وَیَاخَیۡرَ النّٰصِرِیۡنَ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحٰبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ بِرَحۡمَتِكَ یَا اَرۡحَمَ الرّٰحِمِیۡنَ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا...... "یہ اللہ پاک کا کرم ہے کہ اسمِ ذات کے حوالے سے بسم اللہ شریف اور وظیفۂ اویسیہ کمالیہ کے تحائف بھی آپ ہی کو نصیب ہوئے۔"

اظہارِ تشکر کے بعد عرض گزار ہوا...... "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! عام طور پر کتابوں میں وظائف درج تو ہوتے ہیں لیکن انھیں پڑھنے کی اجازت تحریر نہیں ہوتی۔ میری درخواست ہے کہ اس کا اذنِ عام ہو۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا..... "ٹھیک ہے آپ کے متوسّلین بھی پڑھ لیا کریں۔"

میں نے دوبارہ جرأتِ لب کشائی کی...... "یا حبیب اللہ! آپؐ تو دشمنوں کو بھی عطا کرنے والے ہیں، آپ ﷺ کا غلام اپنے عزیز واقارب اور متعلقین کے علاوہ اُمتِ محمدیہؐ کے ہر فرد کو بھی اپنی دعاؤں اور محبتوں میں یاد رکھتا ہے۔" اس پر سرکارؐ کا چہرۂ انور خوشی سے تمتما اٹھا اور آپؐ نے فرطِ جذبات سے میرے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے فرمایا...... "واہ کمال کا بیٹا بھی کمال ہے۔ ٹھیک ہے بیٹے، یہ وظیفہ کتاب میں پڑھ کر یا کسی سے سُن کر اختیار کرنے والے کو بھی وہی اجر ملے گا جو آپ کے متوسلین کو۔" میری ہمت بندھی اور منہ سے بے اختیار نکلا:

نہیں اس جہاں میں کوئی غیر، سب کی
دُعا ہے ہمیشہ رہے خیر سب کی

"آمین۔" حضورؐ نے فرمایا اور اہلِ مجلس نے بھی اس مبارک آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا لی۔ پھر آپؐ نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا:

"کچھ اور ........؟" میں اس بے پایاں کرم نوازی پہ ایک بار پھر اشک بار ہوا اور درخواست کی: "یا رسول اللہ، غلام ایک بار آپؐ کے روبرو اپنی مرضی کا کلام پڑھنے کی اجازت چاہتا ہے۔" ارشاد ہوا "اجازت ہے۔" اس موقع پر فقیر نے اپنی پنجابی کافی بطور ہدیۂ عقیدت پیش کی:

ماہیؐ میرا میماں والاؐ
اَسری دی راتیں دا بنڑا
امبڑ، آمنہؓ دا من چنڑاؐ
اَن حد تے تعظیماں والا
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

سوہنیاں تلیاں دے اوہ چھالے
مزدوری دا مُڑھکا نالے
نوری ہتھ اوہ ڈھیماں والا
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

اوہدے ناں تے وٹّے بولے
بوٹے ٹُرپئے جاں بُلھ کھولے
پالن ہار یتیماں والاؐ
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

صلی اللہ علیہ وسلم
تابش اوہدے گھول گھمائم
ات اُچّا تکریماں والا
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

حاضرین نے لاریب اور ماشاءاللہ کہتے ہوئے داد سے نوازا۔ حضراتِ حسنین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خاکسار کی یہ کاوش خاص طور پر پسند فرمائی۔ امام حسنؓ نے ارشاد کیا.... ”ہندوستان کے لوگ، خصوصاً پنجابی صوفیاءعشقِ حقیقی میں بلند ترین مرتبہ رکھتے ہیں۔“

میں اس دوران نگاہ ادب سے جھکائے خاموش کھڑا تھا اور من میں نور ہی نور تیر رہا تھا۔ ایسے میں حضورﷺ نے فرمایا ”آپ کو بسم اللہ شریف کی ایک اور نسبت سے بھی نوازا جاتا ہے۔ بسم اللہ شریف اور درودِ پاک کو ایک ساتھ ملا کر پڑھا کریں، یہ عمل

ربِ کریم کو بہت پسند ہے۔'' عرض کی...... ''یارسول اللہ ﷺ، کیا یہ نسبت حضرت علیؓ کی بارگاہِ بے کس پناہ سے عطا کی جا رہی ہے؟'' اس پر آپ ﷺ مسکرائے اور ایسا سمجھنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ ایسے میں دانائے راز حضرتِ اقبالؒ کا یہ شعر میری نگاہوں کے سامنے جگمگا اٹھا۔ عرض گزار ہوا:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

یارسول اللہ، آپ وجہِ کائنات ہیں اور حضرت علیؓ مولائے کائنات، شہرِ علم کے در اور بسم اللہ کی با۔ یہی وجہ تھی کہ ایسا خیال ہوا۔ اتنا کہنا تھا کہ ہر جانب سے ماشاء اللہ، اجرکم اللہ کی صدائیں آئیں۔ اس لمحے حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ خادم کو سرفراز فرمائیں۔ درِ علم نے اپنے مبارک ہونٹ عاجز کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اُن لمحات کی منظر کشی کے لیے قلم سورج کی روشنائی چاہتا ہے اور پرِ جبریل خامہ بنے تو کچھ حق ادا ہو۔ تمام حجابات سینے سے لگا کر اٹھا دیے گئے۔ فقیر کو اتنا کچھ اور ایسا کچھ عطا ہوا جو کسی اور نے دیکھا نہ سُنا۔ شیرِ خداؓ نے فرمایا ........ ''یاد رکھیں، عشق ہی مسافت اور عشق ہی منزل ہے۔ آج آپ کا نصیب عروج پر ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پہلے کبھی کسی کو ایسے نوازا گیا ہو۔''

عاجز نے جھک کر پائے عرش مقام چوم لیے اور دیر تک اشک بہاتا رہا مگر یوں کہ رعبِ رسالتؐ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اس حاضری کی آخری بات فقیر کی زندگی کا حاصل ہے۔ عطائیں اوج پر تھیں کہ حضورؐ نے مجھے قریب بلا کر فرمایا...... ''روحانی مسافت کو تحریری شکل میں لانے کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔'' آبدیدہ ہوتے ہوئے عرض کی ''یارسول اللہ ﷺ جب تک اذن نہ ہو آپؐ کا غلام ایک لفظ بھی نہیں لکھتا

اور سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرے ہر قول و فعل کی مجھ سے زیادہ خبر ہے۔" اللہ اللہ آپؐ ایک بار پھر مسکرائے اور ارشاد کیا:

"ہم نے آپ کی کتاب کا نام "سیرُ الافلاک" رکھا ہے۔ اپنی روداد لکھیں اور اسی نام سے شائع کریں۔ سرورق پر بے شک لکھ دیں .......

"بہ اجازت خاتم الانبیاء، سرورِ کونین، حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"

مزید فرمایا...... "سفر کے دوران ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور مشاہدات وانعامات کی ترتیب اسی طرح رکھی جائے جس طرح آپ کے تجربے میں آئے۔ کتاب کا مسوّدہ باغ صاحب کو ساتھ ساتھ دکھاتے رہیں۔ اس کی اشاعت کی منظوری البتہ خلفائے راشدین دیں گے، پھر آخر ش میں خود دیکھوں گا۔ 'سیرُ الافلاک' ایک منفرد اور جامع تصنیف ہوگی ..... اِسے دیکھنے والا بھی حاملِ ثواب ہوگا ..... اِسے محبت اور یقین سے پڑھنے والے کو اجرِ کثیر سے نوازا جائے گا ....... جو کسی کو اچھی نیت سے تحفے میں دے گا اس کے پچھلے صغیرہ گناہ دُھل جائیں گے ..... اسے پڑھ کر عمل کرنے والے پر نارِ جہنم حرام ہوگی ..... آپ کی اجازت سے اس کا درس دینے والا کم از کم ایک بار میرے دربار (دربارِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت سے مشرف ہوگا۔"

فقیر کرم کی اس بارش میں ابد تک سرشار تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا......

"بیٹے ہم نے "دارالفیضان" کو بیت اللہ اور مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت داری کا درجہ دیا تھا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے اسے تسلسل دیا جا رہا ہے۔ ہم آپ کی درگاہ کو "دارالکمال" سے ملقب کرتے ہیں۔ اس جگہ کو بیک وقت کرسی و ہفت افلاک، بیت اللہ، مسجدِ نبویؐ، نجفِ اشرف اور بیت المقدس سے نسبت عطا کی گئی ہے۔ البتہ

اپنی اقامت گاہ کو" گوشۂ باغ " کا نام دیں۔ یہ آپ کی اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت اور نسبت کا انعام ہے۔"

عطا و فیض کی کرنیں فقیر کے قلب کو منور کر رہی تھیں۔ وقتِ رخصت قریب تھا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا..... " بیٹے یاد رکھنا، موت برحق ہے۔" یہ سننا تھا کہ خلفائے راشدینؓ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا......" لاریب، موت ہر شے کی اصل ہے جس کی جانب لوٹنا مقدر ہے۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بے شک یہ کائنات آپؐ ہی کے لیے بنی ہے مگر جب آپؐ پردہ فرما گئے تو پھر ہمیں سوائے ذاتِ الٰہی کے کچھ بھی مستقل نظر نہیں آیا اور دنیا پر اللہ کی حقانیت زیادہ واضح ہوئی۔" سرکارِ رسالت مآبؐ نے فقیر کی جانب نگاہ فرمائی تو میری زبان سے بے اختیار نکلا" كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے)۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا...... " بیٹے! ایک اور نوید یہ ہے کہ جو شخص آپ کی قبر پر فاتحہ پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اسے شرک سے محفوظ رکھے گا اور اس کے والدین سے فشارِ قبر کا عذاب دور فرما دے گا اور مراقب ہو کر بسم اللہ شریف کا ورد کرنے والے کو آپ کی زندگی میں فیض یاب ہونے والوں کی طرح نوازا جائے گا۔" سرکارؐ نے بات ختم کرتے ہوئے فرمایا: " لیکن یاد رہے کہ آپ کو عطا کی گئی تمام بشارتیں صرف ارواحِ مقدسہ اور قلوبِ صالحہ پر ہی دستک دیں گی۔"

باری تعالیٰ کی ان بے پایاں عنایات و نوازشات پر میں گریہ کرتا جاتا اور شکر بجالاتا۔ اس دوران میری یہ حالت تھی کہ جیسے حنوط ہوا بیٹھا تھا، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس عالم میں پھر مبارک باد عطا ہوئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے حضرت علیؓ نے اسمِ اعظم تعلیم فرما کر" فی امان اللہ" کہتے ہوئے فقیر کو رخصت کیا۔

عجب شب تھی

اِک بزمِ تطہیر میں نُور چہرے تھے

میں بھی وہیں سر جھکائے ہوئے تھا

فقط رعب کی حکمرانی تھی جس میں ہر اک شخص لب بستہ بیٹھا ہوا تھا

ذرا آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ اک لوح پر نام لکھے ہوئے ہیں

مرا نام بھی تھا

وہ مہرِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے دیکھ کر مسکراتے

میں قدموں میں سر رکھ کے آنسو بہاتا تو آہستہ آہستہ مجھ کو تھپکتے

اچانک وہ لب ہائے اطہر کھلے

"میرے بچے! کوئی بات کر، کوئی حسرت اگر ہو تو کہہ"

عرض کی "اے حبیبِ خداؐ، نوشۂ انبیاءؑ!

ایک مدّت سے میں اسمِ ذاتِ تعالیٰ کو پانے چلا

اور اب تک وہیں ہوں"

تبسم کیا اور گویا ہوئے

"ربِ اکبر نے اس کو ترے ہاتھ پر لکھ دیا

پڑھ اسے اور پڑھا، دوسروں کو دکھا

یہ تری بندگی کا صلہ ہے"

فرشتے مجھے رشک سے دیکھتے تھے

مرا سر تھا نعلین میں اور پاؤں سرِ آسماں

یہ وہ اعزاز ہے جو شہوں کو بھی حاصل نہیں

# شجرہ سلسلہ عالیہ الاویسیہ کمالیہ

الٰہی، غنی و غفور الرّحیم / کرم کر بنامِ رسولِ کریمؐ

ترے ذِکر سے دل ہو روشن سدا / زباں پر بھر دم ہو صلِّ علیٰ

طفیلِ ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ / سوالی ہُوں اے خالقِ بحر و بر

وہ عثمانؓ ہوں یا جنابِ علیؓ / کرم دونوں کے نام پر ہو جلی

ہے سرسبز جن سے یہ دینِ مبین / خلیفہ وہ چاروں ہی تھے راشدین

رسولِ خدا کے جو ہیں نُورِ عین / عطا ہو بہ نذرِ حسنؓ اور حسینؓ

ہو قسمت میں عشقِ اویسِ قرنؓ / حسن بصریؒ امید کی ہوں پوَن

تصدق دل و جاں بہ شیخِ جُنیدؒ / وہ اسحاق شامیؒ جو سمجھے تھے بھید

خدائے دلِ خواجۂ خواجگاںؒ / ہوا جن سے جیلان جنت نشاں

نجیبِ سہروردؒ، حضرت شہابؒ / ہیں نجم کبیرؒ ان کے اک آفتاب

بہ فیضِ دمِ شیخ احمد کبیرؒ / حسن شاذلیؒ ہوں میرے دست گیر

دُعاگو ہوں رومیؒ ہمارے لیے / بہا نقشبندیؒ ہمارے لیے

سخن لب پہ خانِ محمدؒ کا ہو / کرم حضرتِ حاجی احمدؒ کا ہو

وہ شیخِ شیوخ اور مختارِ کار / مدد گار ہوں شیخ اللہ یارؒ

بہ فیضانِ باغِ حُسینِ کمالؒ / سفر میں، حضر میں ہو احسن مآل

بہ لطفِ درِ شیخ تابش کمال / کھلیں نو بہ نو اس چمن میں نہال

عطا اور احسان حاصل رہے / دمِ مرگ، ایمان حاصل رہے

الٰہی! وہ اپنا ہو یا غیر ہو / دعا ہے کہ سب کی سدا خیر ہو

اویسی کمالی سلامت رہیں / جمالی، جلالی سلامت رہیں

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال

www.darulkamal.com

# نُورمحل

## (گوشۂ تبرکات ونوادرات)

بیاں ہوں کیسے بھلا سب صفاتِ نُور محل
بنا ہے عرش پہ بھی اسمِ ذاتِ نُور محل

نوادراتِ حرَم ہیں چہار سُو روشن
سو آؤ دیکھو مِرا مُمکناتِ نُور محل

مسا و صُبح اسے دیکھتے ہیں جِنّ و مَلک
سَجی ہوئی ہے عجب کائناتِ نُور محل

یہاں پہ حاضری بخشش کا اِک وسیلہ ہے
زمین زادوں پہ ہے اِلتفاتِ نُور محل

ستارے گُھومتے پھرتے ہیں اس کے ہر جانب
مقام نُور کا ہے شَش جہاتِ نُور محل

ہر ایک بخت میں منظر کہاں زیارت کا
کسی کسی کو ہے اذنِ ثباتِ نُور محل

فلک سے اترا ہے سطحِ زمین پر یہ نُور
سو تا بہ حشر ہے باقی حیاتِ نُور محل

ضیائے کون و مکاں ہے عطائے ربِّ کریم
تنی رہے گی ہمیشہ قناتِ نُور محل

یہ لَو سمیٹ لو دنیا میں اپنے ہوتے ہوئے
کھلی ہے تم پہ اگر کائناتِ نُور محل

ہے اُن کا نُور مجسّم مِرے لیے تابش
سو مجھ پہ سایہ کناں ہیں ذواتِ نُور محل

## گلہائے تاریخ

(وصالِ نبویؐ)

جہاں ''نُورٌ علیٰ نُور'' آپؐ سے ہے، آپؐ احمدؐ ہیں
مِرے حسنینؓ کے نانا ہیں، زہرؓا کے اَب و جَد ہیں
ملا ہے مادۂ تاریخِ رحلت غیب سے تابشؔ
''نبی اللہ، کلیم اللہ، صفی اللہ، محمدؐ'' ہیں

۶۳۲ء

## حضرت باغ حُسین کمالؒ

(تاریخِ رحلت)

وہ شاعری، بلند معانی، زرِ کمالؔ
جنت کی سَمت نقل مکانی، زرِ کمالؔ
عشاق چشم نم سے ہی پہچانے جاتے ہیں
اہلِ وِلا کی ایک نشانی زرِ کمال
تاریخ اُن کے وصل کی تابشؔ عطا ہوئی
''عشق و درود و ذکر، کہانی زرِ کمالؔ''

۲۰۰۰ء

## سلسلۂ عالیہ الاویسیہ کمالیہ

(سالِ تاسیس)

چلا تھا حضرتِ باغِ حُسینؒ سے یہ مہر
چمک رہا ہے ہر اک سَمت میں بطورِ یقیں
عطائے غیبی ہے تابش یہ مصرعۂ تاسیس
"طلوعِ خاورِ عشقِ رسولِؐ صدقِ مُبیں"

۱۹۸۴ء

## سِرُّالافلاک

(سالِ تصنیف)

میرے گھر سوغات آ پہنچی ہے ہفت افلاک سے
میرے گھر تشریف لائے آپؐ ختم الانبیاءؐ
سِرُّالافلاک آپؐ نے مجھ کو عطا کی یا نبیؐ
"مخزنِ اسرار و حُبِ میرِ مُرسلؐ مرحبا"

۲۰۰۶ء

# نُور محل

## (سنِ تعمیر)

بہ اذنِ نُورِ مُبینؐ ہے بِنائے نُور محل
فضائے نُور ہو کیوں نہ فضائے نُور محل

کہاں کہاں نہیں جلوہ اِس آستانے کا
کہاں کہاں نہیں پہنچی ضیائے نُور محل

گُلاب و نرگس و سوسن یہاں مہکتے ہیں
ہوائے خُلد ہے گویا ہوائے نُور محل

عجیب نادر و نایاب پائے ہیں تحفے
کہیں نہیں ہیں جو تابش سِوائے نُور محل

دُعا کے ہار پروئے ہیں اہلِ برزخ نے
ملے ہیں سب سے ہی گجرے برائے نُور محل

عطا کیا ہے یہ ہاتف نے مادۂ تاریخ
"عطائے خالقِ صادقؐ ، عطائے نُور محل"

۱۴۴۰ھ

# اظہارِ سپاس

الحمد للہ...... اللہ پاک کے فضل و کرم، نبی کریم ﷺ کی شفقتِ پیہم اور نگاہِ شیخ محترم کے صدقے "سیرُالافلاک" آج بروز ہفتہ، مورخہ "۹ ربیع الاوّل ۱۴۲۷ ہجری" (۸ اپریل ۲۰۰۶ء) تمام ہوئی۔ (البتہ آپ ﷺ کی اجازت سے بعد میں کچھ مقامات کی زیبائش ہوئی اور چند اضافے بھی عبارت کا حصہ بنے۔) فقیر نے اس کا عنوان اور متن بعینہٖ ارشادِ حضور ﷺ کے مطابق رکھا اور وَ اَمَّا بِنِعۡمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ جیسے آفاقی حکم کی تعمیل میں اپنی رُوحانی مسافت کو افادۂ خلق اور بطور تحدیثِ نعمت پیش کیا ہے۔ دعا ہے کہ یہ صاحبانِ ذوقِ سلیم کے لیے طلوعِ خیر کی نوید ہو۔

تھکیا، ٹٹیا عشق دا پاندھی کول مرے جد آسی
بسم اللہ دی برکت پاروں دُنیا، دین کماسی

دل دے ویہڑے جھمّر پیسن خوشیاں تے خوشبوواں
غم دے بدّل کھنڈ پُنڈ ویسن ہوسی دور اُداسی

اِن شاء اللہ تابشؔ اس دے سارے بھارے لہسن
نال فقیراں ماکھی پیسی، مِٹھے میوے کھاسی

# دعوتِ ذکر

ذکرِ خفی قلبی کا طریقہ یہ ہے کہ...... "قبلہ رو ہو کر اندھیرے یا کم روشنی میں مکمل یکسوئی سے بیٹھ جائیں۔ آنکھیں بند کرلیں، نفسانی خواہشات کو دل سے نکالنے اور حواس کو معطل کرنے کی کوشش کریں۔ نیت یہ ہو کہ دل سے گناہوں کا زنگ اتر جائے، غفلت دور ہو اور اس میں اللہ کی محبت پیدا ہو جائے۔ پھر اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ﷺ ۝ اَسْتَغْفِرُ اللهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ ۝ پڑھ کر تصور کریں کہ دل ایک شیشے کی مانند ہے جس پر لفظ "اللہ" سرخ یا سنہری رنگ میں لکھا ہے۔ اسے خیال کے ساتھ پڑھتے ہوئے "ال" اٹھائیں اور "لہ" کی ضرب واپس دل پر لگائیں۔ اس طرح دل ہی دل میں اللہ اللہ کرتے رہیں۔ اس ذکر کو (کم و بیش) دس منٹ کے لیے نمازِ فجر اور مغرب کے بعد معمول بنالیں"..... اس کے ساتھ ساتھ اگر ممکن ہو تو رات دائیں کروٹ لیٹ کر "اللہ اللہ" کرتے ہوئے سو جائیں۔ یوں آپ کی روح شب بھر ذکر میں مشغول رہے گی۔

حضرت انسؓ سے مروی ایک فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو سیر ہو کر چر لیا کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما نے عرض کیا ....... جنت کے باغات کیا ہیں؟ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا "ذکر کے حلقے۔" اسی حکمِ نبویؐ کے تحت، نبیِ کریمؐ اور اکابرینِ سلسلہ کی رُوحانی سرپرستی میں، ہر اتوار ............. "دارالکمال"، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال" میں دن 1 تا 2 بجے محفلِ ذکر منعقد ہوتی ہے جبکہ اپریل کی دوسری اتوار کو سلسلہ کے سالانہ اجتماع کا انعقاد ہوتا ہے۔ ہر طالبِ عشق اور صاحبِ دل کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ سو .......

ع     اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی

## تسبیحِ رومیؒ

(تحفۂ خاص برائے ہر خاص و عام)

ایک ساتھی کسی پریشانی میں مبتلا تھے کہ ایک رات خواب میں انہیں مولانا رومیؒ کی زیارت نصیب ہوئی ۔آپؒ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا "درگاہ دارالکمال بے شمار نسبتوں اور اعزازات کی حامل ہے اور آپ کے شیخ حضرت تابش کمال کی ذات اکابر اہلِ برزخ کی بے پناہ توجہات میں شامل ہے، اس لئے کسی بھی مشکل یا پریشانی میں اس وسیلے سے یہ کلام بطور تسبیح پڑھا کریں۔"

کرم کُن بَر احوالِ مَن خستہ حال
الٰہی بفیضانِ دارالکمال

(ہر خاص و عام اس خصوصی عطا سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔اس کی ایک تسبیح پڑھ کر بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا بلند کریں، اللہ خیر کرے گا۔)

## آراء کی روشنی میں

### ○ حضرت باغ حسین کمال رحمۃ اللہ علیہ (بانی سلسلہ اویسیہ کمالیہ)

...... میں آپ کے اسلوبِ نگارش کی رعنائی اور بانکپن کا مسرت انگیز حیرت کے ساتھ معترف ہوں۔ ماشاءاللہ تم میری توقع سے کہیں بڑھ کر میرے ذوقِ ادب اور شوقِ گُل کی میراث کو اپنا چکے ہو۔

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

---

...... آپ کی یہ خوش ذوقی میرے لیے طمانیت کا باعث بنتی ہے کہ اولاد میں سے کوئی ایک تو میرے ذوقِ ادبی اور شوقِ گل سے بہرہ ور ہے۔ اللہ کرے میری علمی و قلمی اور روحانی روایت کو آپ مزید آگے بڑھانے کا موجب بن جائیں.... اب ظاہر ہے کہ دنیاوی طور پر تو مقامِ ارفع منصب و امارت اور علم و حکمت کے اعتبار سے ہی ہوسکتا ہے سو وہ آپ یقیناً پاکستان کی صدارت و وزارت کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ البتہ رُوحانی اعتبار سے آپ کو ایک ایسے منصب پر فائز کیا گیا ہے کہ حضراتِ اہلِ برزخ آپ پر رشک کرتے ہیں اور اس لحاظ سے مجھے آپ پر ناز ہے۔ (خطوط سے انتخاب)

### ○ صاحبزادہ نصیرالدین نصیر رحمۃ اللہ علیہ (آستانۂ عالیہ۔ گولڑہ شریف)

آپ کی جانب سے ارمغانِ مطہر "سیرُالافلاک" کا قلمی نسخہ نظر نواز ہوا۔ آپ کی نعتیں تو کئی بار پڑھی تھیں اس لیے حضوری کا یقین تھا۔ پھر آپ کے شیخِ محترم اور والدِ معظّم حضرت باغ حسین کمالؒ کی تصنیفات، خاص طور پر "حالِ سفر" کی خواندگی کا شرف بھی

حاصل رہا۔مگراب جو" سیرُالافلاک" دیکھی تو گویا قلب کا عالم ہی اور ہے اور روح ہے کہ "بارک اللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ" کا ورد کررہی ہے۔آپ نے بفضلِ باری تعالیٰ مسلکِ اولیاء کے منکرین کو قرآن و حدیث کے ایسے صاف وشفاف ثبوت دیے ہیں جو ازبسکہ کافی وشافی ہیں۔آپ ماشاءاللہ صاحبِ علم بھی ہیں اور شاعرِ رنگیں نوا بھی،لہٰذا میں آپ کے مناصب کی تصدیق وتوثیق بھی کرتا ہوں اور اپنی غزل کے دوشعر بھی بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں:

منتخب جس کو وہ فرمائے یہ اُس کی مرضی
کارِ ہر سنگ نہیں لعلِ بدخشاں ہونا
فقر کا تاج جو رکھے ہوئے ہوں سر پہ نصیرؔ
ہیچ ہے اُن کے لیے وقت کا سلطاں ہونا

یقینِ واثق ہے کہ" سیرُالافلاک" کی اشاعت اہلِ حق کے لیے نوید ثابت ہوگی۔

○ حضرت واصف علی واصف رحمۃ اللہ علیہ (معروف روحانی سکالر)

میں آپ کے رُوحانی اسفار کا مختلف عالمین میں شاہد ہوں۔کئی بار تو آپ کی زیارت کچھ اس انداز سے ہوئی کہ سبحان اللہ۔یہ مراتبِ عالیہ صرف غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہی مخصوص ہیں اور ان میں آپ کی حیثیت یقیناً ایک نوجوان قائد جیسی ہے،اور کیوں نہ ہو آخر آپ بیٹے کس باپ کے ہیں۔آپ کی ارسال کردہ نعتیں اور سیر وسلوک سے متعلق نثری تحریریں ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالیں، پھر کئی بار مکرّر خواندگی کا لطف اٹھایا۔ جزاک اللہ، عجیب سرشاری ہے کہ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔تصوّف اگر عملی ہو اور انسان کا اثبات کرتا ہو تو بڑی نعمت ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ آپ کی نظم ونثر آرائش سے پاک ہے،ایسی تحریریں ہی دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ (ایک خط سے اقتباس)

### ○ جناب حفیظ تائبؒ (صدارتی تمغہ حُسنِ کارکردگی)

محترمی! ''سیرُالافلاک'' کا مسوّدہ دیکھا، رُوح معطّر ہوئی۔ ایک منظر یاد آیا کہ میں اور حضرت باغ حسین کمال رحمۃ اللہ علیہ سٹیج پر بیٹھے ہیں۔ کسی درس گاہ میں طلباء کے درمیان نعت خوانی کا مقابلہ ہے اور ججوں کی جانب سے آپ کو اوّل انعام عطا کیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو چُن لیا۔ حضرت باغ حسین کمالؒ کی ''حالِ سفر'' کے بعد تصوّف اور صوفیاء کے باب میں گُہرافشانی آپ ہی کا کام تھا اور بے شک آپ نے کہیں گلاب، کہیں موتی رکھ دیے۔ آپ کی تحریر، آپ کی صداقت کو پوری طرح عیاں کرتی ہے۔ دلائل اور براہین ثابت کرتے ہیں کہ آپ راہِ سلوک میں یکتا ہیں۔ آپ سے ملاقاتوں میں جب جب گفتگو رہی اُس پر بے اختیار یہی کہنے کو جی چاہتا ہے: ''تروتازہ، تروتازہ، تروتازہ''۔ میں آپ کے روحانی سفر کو اُس عشق کا انعام سمجھتا ہوں جو آپ کو اللہ جل علی شانہ، اور اُس کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبؐ کے صدقے ''سیرُالافلاک'' کو استفادۂ خلق کا ذریعہ قرار دے۔ ناچیز ان دنوں زیادہ علیل ہے۔ آپ سے خصوصی طور پر دُعا کی درخواست ہے۔

### ○ قاضی عزیز الرحمٰنؒ نقشبندی، مجددی (ممبر شوریٰ عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت)

''سیرُالافلاک'' اللہ کی تائید و مرضی سے خلقِ خدا کی راہنمائی کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ یہ مسالک و مکاتیب کی ناپسندیدہ بحثوں سے پاک، ذہن کو روشنی اور روح کو پاکیزگی عطا کرنے والا ایک عام فہم درس ہے۔ اس کا مطالعہ علوم کے نئے آفاق سے روشناس کراتا اور معانی کے نئے دریچے کھولتا ہے۔ حُبِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کی سعادت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی سرپرستی سے بہرہ مند کسی ہستی کی صحبت میں رہ کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے کہ اس نے نہ صرف ہمیں بہت سے بھولے سبق یاد

دلا دیے بلکہ صاحبِ کتاب کی صورت میں ایک عارفِ وقت کی نشاندہی بھی کر دی جو ہر خاص و عام کے لیے بہت بڑی عطا ہے۔

### ○ صاحبزادہ سید منظور الکونین (صدارتی تمغہ حُسنِ کارکردگی)

"سیرُ الافلاک" کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہر منزل کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان ہو رہا ہے کہ جیسے میں نے یہ تمام سفر خود طے کیا ہے۔ سبحان اللہ۔ جس طرح خالقِ کائنات نے آپ پر کرم کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہات اور چشمِ عنایت آپ پر ہوئی ہے، ایسا سننے میں کم آیا ہے...... آپ نے جس سلاست اور آسان پیرائے میں اپنی حضوریوں کو رقم کیا ہے، رہتی دنیا تک یہ حقائق جگمگاتے رہیں گے۔

### ○ جناب خورشید عالم گوہر قلم (صدارتی تمغہ حُسنِ کارکردگی)

"سیرُ الافلاک" اُن روحانی امور و مشاہدات سے متعلق ہے جن تک عامۃ الناس کے اذہان و قلوب کی رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف اہلِ حق کا ورثہ ہیں اور وہی ان تجلّیات و انوارات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ حقیقت و معرفت کے خوبصورت بیان پر مبنی یہ کتاب خصوصی طور پر سالکانِ طریقت کے لیے رقم فرمائی گئی ہے تاکہ نشانِ راہ مقرر کیا جا سکے۔

حضرت تابش کمال ایک عارف بالیقیں، عاشقِ رسولؐ اور واقفِ اسرارِ لدُنّی انسان ہیں۔ آپ کی شخصیت میں جو نفاست و نزاکت اور پاکیزگی ہے وہ بجا طور پر آپ کے اُن مشاہداتِ حق کا پرتو ہے۔ آپ نے خیال سے لے کر فنائے خودی تک جو اسرار و رموز عیاں کیے ہیں اس سے مجھ جیسے گمراہوں کو یقیناً اُن منزلوں کا پتا چل سکے گا جن تک رسائی کے لیے اہلِ حق کا سہارا لازمی ہوتا ہے۔

.....البتہ رُوحانی اعتبار سے آپ کو ایک ایسے منصب پر فائز کیا گیا ہے کہ حضرات برزخ آپ پر رشک کرتے ہیں اور اس لحاظ سے مجھے آپ پر ناز ہے..... اللہ کرے میری علمی و قلمی اور رُوحانی روایت کو آپ مزید آگے بڑھانے کا موجب بن جائیں۔

(حضرت باغ حسین کمالؒ)

.... مگر اب جو "سیرُالافلاک" دیکھی تو گویا قلب کا عالم ہی اور ہے اور روح ہے کہ "بارک اللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ" کا ورد کر رہی ہے۔ آپ نے بفضلِ باری تعالیٰ مسلکِ اولیاء کے منکرین کو قرآن و حدیث کے ایسے صاف و شفاف ثبوت دیئے ہیں جو از بسکہ کافی و شافی ہیں۔

(صاحبزادہ نصیر الدین نصیرؒ)

میں آپ کے رُوحانی اسفار کا مختلف عالمین میں شاہد ہوں۔ کئی بار تو آپ کی زیارت کچھ اس انداز سے ہوئی کہ سبحان اللہ۔ یہ مراتبِ عالیہ صرف غلامانِ محمد ﷺ سے مخصوص ہیں اور ان میں آپ کی حیثیت یقیناً ایک نوجوان قائد جیسی ہے۔

(حضرت واصف علی واصفؒ)

حضرت باغ حسین کمالؒ کی "حالِ سفر" کے بعد تصوف اور صُوفیاء کے باب میں گُہرافشانی آپ ہی کا کام تھا اور بے شک آپ نے کہیں گلاب کہیں موتی رکھ دیے۔

(جناب حفیظ تائبؒ)

یہ "سیرُالافلاک" مسالک و مکاتیب کی ناپسندیدہ بحثوں سے پاک، ذہن کو روشنی اور روح کو پاکیزگی عطا کرنے والا ایک عام فہم درس ہے۔ اس کا مطالعہ علوم کے نئے آفاق سے روشناس کراتا اور معانی کے نئے دریچے کھولتا ہے۔

(قاضی عزیز الرحمنؒ نقشبندی)

آپ نے جس سلاست اور آسان پیرائے میں اپنی حضوریوں کو رقم کیا ہے، رہتی دنیا تک یہ حقائق جگمگاتے رہیں گے۔

(صاحبزادہ سید منظور الکونین)

حضرت تابش کمال ایک عارف بالیقین، عاشقِ رسولؐ اور واقفِ اسرارِ لدُنّی انسان ہیں۔ آپ کی شخصیت میں جو نفاست و نزاکت اور پاکیزگی ہے وہ بجا طور پر آپ کے ان مشاہداتِ حق کا پرتو ہے۔

(جناب خورشید عالم گوہر قلم)

دار الکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، پنوال، چکوال

www.darulkamal.com